جلد ۸۸

اکتوبر ۱۹۷۷ء

عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن کے اجزاء

تفسیر پارۂ اوّل	۶/۵۰ روپے
تفسیر سورہ الفاتحہ والبقرہ	۹/- "
تفسیر سورہ التوبہ	۶/۵۰ "
تفسیر سورہ الفرقان	۳/- "
تفسیر سورہ لقمان	۲/- "
تفسیر سورہ یٰسٓ	۲/۲۵ "
تفسیر سورہ الفتح	۲/۲۵ "
تفسیر سورہ الحجرات	۲/۵۰ "
تفسیر سورہ الرحمٰن	۲/۲۵ "

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۸ | اکتوبر ۱۹۷۷ء مطابق شوال ۱۳۹۷ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زرِ سالانہ ۲۰/- روپے فی پرچہ ۲/- روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جو لوگ مسلمانانِ پاک و ہند کے دینی مزاج ، اخلاقی شعور اور اُن کے اندر پیدا ہونے والے تغیرات کا تھوڑا سا بھی علم رکھتے ہیں ، وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ غیر ملکی علوم و فنون کی یلغار کے نتیجہ میں اُبھرنے والی عقلیت پرستی کی تحریک نے ایک طبقے کو کافی حد تک مرعوب و متاثر تو کیا لیکن وہ اسے اسلام کا باغی نہ بنا سکی ۔ اسی طرح مغربی تہذیب و تمدن کی یورش سے مسلمانوں کے ایک خاص گروہ کے اندر اخلاقی بگاڑ تو بلاشبہ رونما ہوا لیکن عوام میں اسلامی اقدار کا احترام بدستور باقی رہا اور اخلاقی بگاڑ کوئی ہمہ گیر وبائی صورت اختیار نہ کر سکا ۔ مگر اس انحطاط کو بھی مسلمانوں کے حساس بہی خواہوں نے بالکل آغاز ہی میں پوری شدت سے محسوس کر کے اِس ناپاک عمل کو روکنے اور حالات کو رُو بہ اصلاح کرنے کے لیے اپنی بساط کے مطابق کوششیں شروع کر دیں ۔ اہلِ علم کے ایک گروہ نے پوری قوتِ استدلال کے ساتھ مغربی تہذیب کا فسوں توڑا ، دوسرے گروہ نے بڑے علمی انداز میں دیگر مذاہب پر اسلام کی برتری ثابت کی ، تیسرے گروہ نے جگہ جگہ دینی مدارس قائم کر کے قرآن و سنت کی تعلیم کو عام کیا ۔ یہ مدارس مغربی تہذیب کے طوفان میں ایمان کی سلامتی کے لیے کشتی نوح ثابت ہوئے ۔ مسلم علماء کے ایک گروہ نے اسلام کے بارے میں غیروں کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں سے مسلمانوں کے دل و دماغ کو صاف کیا اور دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کی کہ صرف اسلام ہی دینِ حق ہے ۔ مسلمان مؤرخین نے اسلامی تاریخ کے رُخ روشن سے پردہ ہٹا کر اُمتِ مسلمہ کو اپنے تابناک ماضی سے آشنا کیا ۔ پورے ملک میں بہت سی اصلاحی انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے تاکہ اہلِ ایمان کی نئی نسل کو

نام نہاد جدید تہذیب و تمدن کی دست برد سے بچایا جا سکے۔

مسلمان رہنماؤں اور ملت کے ان خیر خواہوں کی کاوشوں کے نتیجہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثاروں کے اندر یہ اُمنگ پیدا ہوئی کہ انہیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ ان خطوط پر استوار کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کیے ہیں۔ چنانچہ آزادی وطن کی ہر تحریک میں مسلمانوں نے اسی جذبے سے سرشار ہو کر بھرپور حصہ لیا۔ تحریک خلافت اور تحریک پاکستان اسی پاکیزہ جذبے کا عملی اظہار تھیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب کوئی قوم اس مقدس آرزو کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہو تو اس کے اندر غیر اسلامی تحریکات پرورش نہیں پا سکتیں۔ چنانچہ تحریک خلافت سے لے کر قیام پاکستان تک مسلم قوم کے اندر جنم لینے والے لادین عناصر کی اول تو تعداد ہی بہت کم رہی اور جو تھے بھی، وہ بالکل دبے رہے اور انہیں کسی مرحلہ پر بھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ کھلّم کھلا دینِ حق کے خلاف کوئی تاثر خائی کر سکیں۔

پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد جب مسلمانوں کو یہ موقع فراہم ہو گیا کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق تشکیل دیں تو ان کی صفوں میں چھپے ہوئے اعدائے دین لنگر لنگوٹے کس کر سامنے آگئے اور اس بات کے لیے کوشاں ہوئے کہ مسلمانوں کا یہ عزم کسی طرح پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے پائے۔ انہوں نے اپنی اس ناپاک جدوجہد کے لیے چار میدان خاص طور پر منتخب کیے: ذرائع ابلاغ، بیوروکریسی، مزدور انجمنیں اور ثقافتی ادارے۔ لاہور میں پاکستان ٹائمز اور امروز کے دفاتر لادینی سرگرمیوں کے خصوصی مراکز بنے۔ ملک کے اندر جس قدر ریڈیو اسٹیشن قائم تھے ان سب پر ایک گہری سازش کے ذریعے یہ سرخ عناصر پوری طرح قابض ہو گئے۔ مزدوروں کے اندر انہوں نے ایسی نمائشی تنظیمیں قائم کر لیں جن کی غرض و غایت مزدوروں کے حقوق کا تحفظ نہ تھا بلکہ آجر و اجیر کے درمیان باہم تصادم کی صورت پیدا کر کے سرخ انقلاب کی راہ ہموار کرنا تھا۔ ثقافتی انجمنوں اور اداروں نے ان لادین عناصر کی سرپرستی میں عوام، خصوصاً نوجوان نسل کو اخلاقی طور پر بگاڑنے کی سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں۔ پھر ان کا ایک طبقہ حزب اختلاف کا دمساز بن کر اور دوسرا حکومت کے ایوانوں میں کلیدی اسامیوں پر مسلط ہو کر راعی اور رعایا

کے تعلقات مسلسل خراب کرتا رہا۔ ہمارے ملک کے حکمران چونکہ شروع ہی سے ان بے دین عناصر کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اُن کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے حکمرانی کے آمرانہ طور طریقے اپنانے کی کوشش کی۔ ان فرمانرواؤں کی یہ غلط اور عاقبت نااندیشانہ روش چونکہ دین کے ان دشمنوں کے لیے سودمند تھی اس لیے انہوں نے پاکستان کے سربراہوں کو کبھی راہِ راست پر نہ آنے دیا۔ پاکستانی عوام کی اسلام سے گہری عقیدت اور جذباتی لگاؤ کو دیکھ کر اشتراکی دانشور اس بارے میں قطعاً پُر اُمید نہ تھے کہ انہیں چند سالوں میں اشتراکیت کا حلقہ بگوش بنالیں گے لیکن اس بات سے کافی حد تک مطمئن تھے کہ اگر وہ حکمران طبقہ میں پوری یکسوئی سے کام کرتے رہے تو انہیں اس میں سے ایسی معتدبہ تعداد ضرور دستیاب ہو جائے گی جو اگرچہ اسلام کی کھلی دشمن تو نہ ہو لیکن دینِ حق سے یکسر بیگانہ اور کفر والحاد کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھنے والی ہوگی جو حکمران اپنے دل میں آمرانہ عزائم پالتے ہوں خوشامد اُن کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ ہر لمحہ اس بات کے آرزومند رہتے ہیں کہ کچھ لوگ اُن کے کانوں میں خوش کُن باتیں ڈالتے رہیں۔ اس ملک کے بے ضمیر اور لادین عناصر بڑی آسانی سے انہیں شیشے میں اُتار کر اُن سے نہ صرف اپنے لیے اور اپنے ہم مسلک افراد کے لیے ہر قسم کی دُنیوی مراعات حاصل کرتے رہے بلکہ انہوں نے حکمرانوں کو ہر معقول اور منصفانہ قدم اُٹھانے سے بھی باز رکھا تاکہ کہیں عوام میں مقبول ہو کر اِن عناصر کی مدح وستائش اور معاونت ودستگیری سے بے نیاز نہ ہو جائیں اور اس راہ پر نہ چل نکلیں جسے اسلام نے صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا ہے اور جس پر چلنے کے لیے مسلمانوں نے ایک الگ خطۂ ارض کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ دین دشمن عناصر شروع ہی سے پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھ رہے تھے اور انہیں اپنی قوت اور عوام میں اپنے اثر ونفوذ کا اس قدر زیادہ غرّہ تھا کہ انہوں نے فوجی سازش کے ذریعے اشتراکی اقلیت کو مسلم اکثریت پر بالجبر مسلّط کرنے کی کوشش کی لیکن قادرِ مطلق نے ان ناپاک منصوبوں کو یکسر خاک میں ملا دیا اور یہ ملک خونی انقلاب کی تباہ کاریوں سے بچ گیا۔

اس مسلح سازش کی ناکامی کے بعد مارکس اور لینن کے ان پرستاروں کو اپنی قوت کا صحیح اندازہ ہو گیا اور اُن کے سامنے یہ حقیقت بھی کُھل کر آگئی کہ وہ اس ملک پر کسی فوجی انقلاب کے ذریعے قابض نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے انہوں نے ایک طرف تو ثقافتی اور معاشی میدانوں میں اپنی تخریبی کاروائیاں زور شور سے

شروع کر دیں اور دوسری طرف شاہ کے مصاحبین بن کر ملک کے اندر لادین قوتوں کو اُبھارنے اور منظم کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں کی دین کے خلاف سازشوں اور معاندانہ سرگرمیوں کے نتائج ہماری زندگی کے ہر گوشے میں بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔

آپ قیامِ پاکستان سے لے کر اس وقت تک کے حالات پر غور کریں تو آپ یہ بات شدت سے محسوس کریں گے کہ جو سرزمین اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کی گئی تھی وہ آہستہ آہستہ کفر و الحاد، انتشار، اکیت اور فسق و فجور کی آماجگاہ بنتی جا رہی ہے۔ اس ملک کے آئین کے بارے میں یوں تو شروع ہی سے ایک الجھاؤ پیدا کیا گیا اور مغرب زدہ طبقوں نے شرارت کے طور پر اس خدشہ کا اظہار شروع کر دیا کہ چودہ سو برس پرانا دستور دورِ جدید کے مملکتی تقاضوں کو آخر کس طرح پورا کر سکتا ہے؟ ان کے الفاظ سے اسلامی دستور کے عہدِ جدید میں دوسرے وساتیر پر تفوق و برتری کے بارے میں شکوک و شبہات برابر پیدا ہوتے رہتے تھے مگر وہ جس چیز پر زور دیتے تھے وہ اس قدر تھی کہ اس دستور کے اندر حالات کے مطابق تغیر و تبدل کر دیا جائے۔ اس وقت اس ملک کے کسی طبقے کی ہمت نہ تھی کہ وہ اسلامی نظام کے کسی ایک حصے کو بھی مسترد کر کے یہاں کفر کی عملداری قائم کرے۔ اس زمانے میں نظامِ شریعت کے خلاف سب سے خوفناک سازش جو کی جا سکی وہ سنت کی آئینی حیثیت کو مشتبہ بنانا تھا۔ لیکن علمائے حق کی کوششوں سے یہ فتنہ آغاز ہی میں دب کر رہ گیا اور امت کے اجتماعی ضمیر نے اسے کسی حیثیت سے بھی بڑھنے اور پھیلنے نہ دیا۔

ملک غلام محمد کے عہدِ اقتدار میں جب ملک کی سیاسی زندگی زیر و زبر ہوئی اور اُسے عوامی حمایت کھو کر ایک خاص طبقے کی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تو اس کے ارد گرد چند ایسے دانشور جمع ہو گئے جو اگرچہ کافر تو نہ تھے مگر دلدادۂ فرنگ ہونے کی وجہ سے اسلام سے دور اور مغرب کے کافرانہ نظامِ زندگی کے قریب تر تھے۔ خصوصاً مغربی معاشرت انہیں بہت پسند تھی اور وہ اس کا کھلے بندوں اظہار بھی کرتے تھے۔ ان فرنگیت مآب اور حکومت میں دخیل اہلِ ہنر کی سرپرستی میں کفر کو آگے بڑھنے کے بڑے مواقع فراہم ہوئے۔ انہوں نے ثقافت کے نام پر فسق و فجور کو خوب پھیلایا اور اس طرح

ملحدانہ افکار و نظریات مسلم معاشرے میں جڑ پکڑنے لگے - ایمان اور پاکبازی دونوں لازم و ملزوم ہیں - اسی طرح الحاد اور فسق و فجور میں چولی دامن کا ساتھ ہے - جس دل میں ایمان کی حرارت ہوگی وہ لازمی طور پر نیکی کی طرف ہی راغب ہوگا اور جو شخص فسق و فجور میں مبتلا ہوگا اُسے کفر ہی راس آئے گا، جس معاشرے میں بے حیائی پھیلتی ہے اس میں ضبطِ نفس کے بندھن ٹوٹتے ہیں، حق و باطل کا امتیاز مٹتا ہے اور کفر اُسے تر نوالہ سمجھ کر بڑی آسانی سے نگل جاتا ہے۔

سکندر مرزا کے دَورِ حکومت میں بھی ملک کے اندر فحاشی کا دائرہ مسلسل پھیلتا رہا اور کفر و الحاد کو معاشرے کے مختلف طبقوں خصوصاً اونچے طبقے یا حرام خور ملازمین کے اندر نفوذ کرنے کے مواقع ملتے رہے - یہ شخص اپنی روایتی نا اہلی اور سیاسی شعور کے فقدان کی وجہ سے نوکرشاہی کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی تھا - خاص طور پر وہ سرکاری عہدیدار جو اس کے ساتھ براہ راست وابستہ تھے وہ اس سے جو کام چاہتے باسانی لے لیتے - اسلامی اقدار ان کے احترام اور اُن کی پابندی کے لحاظ سے مسلم معاشرے کی صورتِ حال مسلسل بگڑتی رہی - سیاسی اور معاشی خلفشار اور ملک کے نظامِ تعلیم میں کربناک انتشار اور نظم و نسق میں خوفناک ابتری نے تخریب پسند قوتوں کی پوری طرح حوصلہ افزائی کی - نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء میں دین سے بغاوت کے جو رجحانات ایک نہایت ہی محدود سے طبقے میں نظر آتے تھے اور جن کی وجہ سے یہ طبقہ اپنے آپ کو امت سے بے تعلق سا محسوس کرتا تھا وہ معاشرے کے دوسرے طبقوں میں بھی پھیلنے لگے - اس وقت اس امر کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے کہ ان باطل افکار سے کتنے فیصد لوگوں نے کس حد تک اثر قبول کیا - لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے دلوں میں کفر و الحاد کے خلاف جو شدید نفرت تھی اُس کی شدت کسی حد تک کم ہوگئی اور وہ ملحد طبقوں سے جو بُعد و بیگانگی محسوس کرتے تھے وہ غیر شعوری طور پر مداہنت میں تبدیل ہونے لگی۔

ملک غلام محمد اور سکندر مرزا کے دَورِ اقتدار میں اس ملک کے اندر دینِ حق کو جو نقصان پہنچا تاریخ کا کوئی طالب علم اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا - لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ یہ دونوں فرمانروا اکبر کی طرح دین کا کوئی ایسا تصور نہ رکھتے تھے جسے وہ پاکستان میں حکومت کی قوتِ نافذہ کے ذریعے عوام پر

مسلط کرنا چاہتے ہوں۔ وہ دین کے بارے میں اپنے کوئی خاص عزائم بھی نہ رکھتے تھے جن کی تکمیل کے لیے انہیں اقتدار کی ضرورت لاحق ہو۔ اُن کی سیرت و کردار اور اُن کی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں اور محلاتی سازشوں کو دیکھ کر اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نشۂ اقتدار کی خاطر مسندِ اقتدار سے طویل عرصے کے لیے چمٹا رہنا چاہتے تھے۔ اس سے زیادہ انہیں اقتدار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ہمارے اس ملک میں جو حکمران ایک گزرے ہوئے مغل فرمانروا کی طرح دین کے بارے میں اپنے مخصوص تصورات اور اجتماعی زندگی کا مخصوص نقشہ ذہن میں رکھ کر تختِ اقتدار پر قابض ہوا وہ محمد ایوب خاں تھا۔ جن لوگوں نے اس کی کتاب فرینڈز ناٹ ماسٹرز مطالعہ کی ہے وہ اس کے دینی رجحانات، اسلامی تعلیمات کے بارے میں اس کے ذاتی خیالات اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کے متعلق اس کے ارادوں سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اسلام کا دشمن تو نہ تھا لیکن اسلامی تعلیمات کے اندر ایسی تبدیلیاں کرنا چاہتا تھا جن سے پاکستان میں دین کا نام تو رہے لیکن جو اجتماعی نظام قائم ہو وہ اس ملک کو کمال اتاترک کا ترکی بنا دے۔ چنانچہ اس شخص نے اسلامی نظام کی اساس منہدم کرنے کی غرض سے سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑے عامیانہ انداز میں حملے کیے۔ اس کا ایک خطبۂ صدارت جو اس نے اُونچے فوجی افسروں کے ایک خاص اجتماع میں دیا وہ اس کے اصل عزائم کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ اُس میں سنّت کی آئینی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے پہلے تو راویوں اور اندازِ روایت کا مذاق اُڑاتا ہے پھر تمسخر کے انداز میں کہتا ہے جب اکبر اور جہانگیر کے حالات صحت کے ساتھ قلمبند نہیں کیے جا سکتے جو صرف تین سو برس کے دَور کے حکمران ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے کے کسی شخص کے سوانح من و عن احادیث و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہوں۔ اس ضمن میں فیلڈ مارشل صاحب نے عربوں پر ایک الزام یہ بھی عاید کیا کہ ان لوگوں کی قوتِ متخیلہ بہت تیز ہے اس لیے بہت کچھ زیب داستان کے لیے بڑھا لیتے ہیں۔ پھر اس شخص نے اس کتابچہ میں وقت کے تقاضوں کا بھی بڑے شدومد کے ساتھ ذکر کیا اور مذہب کے بارے میں یہ نکتہ آفرینی کی کہ مذہب انسان کے لیے ہے نہ کہ انسان مذہب کے لیے، اس لیے مذہب کو انسان اور اُس کی ضروریات کے تابع رہنا چاہیے۔

جب پاکستان میں ہمہ مقتدر شخصیت کے دینی افکار و نظریات یہ ہوں تو وہاں کیا باطل کو کھل کھیلنے کے مواقع فراہم نہ ہوں گے؟ چنانچہ اس آمرِ مطلق کے عہد میں اسلام دشمن طاقتوں نے دینِ حق کا راستہ روکنے اور الحاد کی راہ ہموار کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور دینی طبقوں کو معاشرے میں بے وقعت اور غیر مؤثر بنانے کے لیے انتہائی کوشش کی۔ حکومت نے ملک کے لادین عناصر کو دین کی بیخ کنی کے لیے جو سازگار ماحول عطا کیا اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ پہلے سے زیادہ منظم اور مستعد ہوئے اور انہیں اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل میں خاصی کامیابی بھی ہوئی۔ ہمارے نزدیک لادین عناصر کے لیے ایوب خاں کا دور اقتدار انعام و اکرام کا دَور تھا جس میں ان پر مَن بھی خوب برسا اور حکومت کے ایوانوں میں بھی اُن کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ پھر اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں مسلم معاشرے کی دینی بنیادیں ڈھاکر اسے از سرِ نو کفر و الحاد کی نئی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اعدائے دین کے ہاتھ میں سنت کی مخالفت کی صورت میں ایک کارگر ہتھیار تھما دیا گیا۔ چنانچہ دیکھیے اسلام دشمن قوتوں نے سنّت کی آئینی حیثیت کو جس قدر شدت کے ساتھ ایوب خاں کے دور میں چیلنج کیا اس قدر کسی دوسرے دَور میں نہیں کیا۔

یحییٰ خان کا دورِ حکومت دینی نقطۂ نظر سے ملک غلام محمد اور سکندر مرزا کا دَور کہا جا سکتا ہے۔ اِس شخص کے دین کے بارے میں کوئی عزائم اور تصورات نہ تھے۔ اقتدار سے اس کی ایک ہی غرض وابستہ تھی کہ وہ ملک کے سیاہ و سپید کا مالک ہو۔ اس کے وسیع ذرائع و وسائل تنہا اس کے قبضہ میں ہوں اور انہیں وہ اپنی عیش پرستیوں کے لیے جس طرح چاہے خرچ کرے اور کوئی اس سے باز پرس نہ کر سکے۔ ملک میں اس اندوہناک صورت حال سے بھی لادین عناصر ہی کو فائدہ پہنچا۔

پاکستان میں کھل کر مادہ پرستانہ نظریات کے ساتھ اشتراکیت کی عملداری قائم کرنے کے لیے جو شخص گہری سازش کے ذریعے تختِ اقتدار پر قابض ہوا وہ ذوالفقار علی بھٹو ہے۔ اس نے ایک اشتراکی ملک کی عوامی جماعت کے نام پر ایک جماعت کی بنیاد رکھی۔ ہٹلر نے (باقی برصفحہ ۲۴)

دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط

(سورہ النحل کی آخری آیات کی روشنی میں)

از جناب نعیم صدیقی صاحب

(۳)

ہدایت و ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ آگے کا ارشادِ خداوندی یہ ہے کہ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ یقیناً تیرا رب پوری طرح ایسوں کو بھی جانتا ہے جو اس کا راستہ چھوڑ کر گمراہی میں پڑے، اور وہی ہدایت پانے والوں کا بھی مکمل علم رکھتا ہے۔

اگر اس ارشاد کا حکمِ ماسبق (جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ) سے تعلق دیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ دعوتِ حق کا کام کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا تعالیٰ جدالِ احسن سے انحراف کرنے والوں کو بھی اور اس کا التزام کرنے والوں کو بھی پوری طرح جانتا ہے۔ تم جو بھی طرزِ عمل اختیار کرو گے وہ اس کا نگران اور رقیب ہے۔

لیکن "ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ" اور "مُهْتَدِيْنَ" جیسے الفاظ اس محدود و مخصوص مفہوم کی طرف جانے نہیں دیتے۔ بات زیادہ وسیع المعنیٰ ہے۔

اسے سمجھنے کے لیے یہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ داعی پر جب دعوت کی کامیابی کی حرص غلبہ کرتی ہے، اور لوگوں کے اصلاح یافتہ ہونے کی تمنائے بیتاب لاحق ہوتی ہے اور اسلام کے غلبے اور اس کے مخالفین و معاندین کی شکست کی عاجلانہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے تو وہ حکمت اور موعظۂ حسنہ اور جدالِ احسن کے تقاضوں سے انحراف کرتا ہے۔ اس خطرے کا سدِّ باب کرنے کے لیے داعیان کی ذہنی تربیت کا یہ سامان اس آیت میں کیا گیا ہے کہ ہدایت و ضلالت کے متعلق بڑی اہم وضاحت کر دی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ لوگوں

کی ہدایت و ضلالت کی باگ ڈور کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں، اور کسی کو ہدایت کی سعادت ملنے اور کسی کو ہدایت سے محرومی کے عذاب میں مبتلا ہونے کے لیے مشیتِ الٰہی کے جو قوانین جن ذہنی و اخلاقی احوال کے مطابق کام کرتے ہیں ان کا علم صرف خدا ہی کو ہے۔ اللہ کے نیک سے نیک بندوں، اور زیرک سے زیرک دعوت دینے والوں کے بس میں بھی نہیں ہے کہ وہ کسی فرد یا گروہ یا قوم کو لازماً ہدایت کی راہ پر ڈال دکھائیں ـــــ خواہ وہ حکمت اور موعظہ حسنہ اور جدال احسن کے اصولوں کی کیسی ہی پابندی کیوں نہ کریں۔

ایک سچا داعی یہ بات خدا کے سپرد کر دیتا ہے کہ بس وہی اس بات کو جانتا ہے کہ مخاطبینِ دعوت اور مجادلین میں سے کون ہدایت سے محروم ہونے والا ہے اور کون اس نعمت سے بہرہ ور ہونے والا ہے۔ جن کو خدا کی راہ سے بھٹکنا ہے انہیں بھی وہ خوب جانتا ہے، اور جن کو راہ یاب ہونا ہے ان کا بھی اسے پورا علم ہے۔ لہٰذا سعیِ دعوت کو صحیح خطوط پر، مقررہ شرائط کے ساتھ انجام دے دینے کے بعد پورے اطمینان سے نتائج خدائے اَعْلَم کے سپرد کر دینے چاہییں۔ ہدایت کا پیغام دینا بندوں کا کام ہے اور ہدایت دینا خدا کے اپنے اختیار میں ہے۔ یہ فیصلہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے کہ کون سا مخاطب کن کن مراحل سے گزرنے کے بعد کب ہدایت یاب ہوگا، کس نے اپنے دل و دماغ کو کم آلودہ کیا ہے اور کس نے زیادہ، اور کس نے اپنے کردار میں کم سے کم رخنے پیدا ہونے دیے ہیں اور کس نے اس کا ستیاناس کر لیا ہے، کس کے دل کے دروازے دلائل کے لیے آسانی سے کھلتے ہیں اور کس کے اندر تعصبات اور عصبیتوں کی مضبوط دیواریں کھڑی ہیں۔ خدا ہی اس امر کا علم رکھتا ہے اور فیصلہ کرنے والا ہے کہ کسے جلدی آنا ہے اور کسے دیر میں۔ دعوت کی سعی کی ذمہ داری سے آگے بڑھ کر جب آدمی اپنے ناقص علم کے ساتھ دعوت کے نتائج حسبِ منشا حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے تو اس میں عجلت پسندی پیدا ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں زور زبردستی سے کام لینے کے لیے مصیطرانہ ذہنیت نمودار ہوتی ہے۔ حالانکہ قرآن میں حضوؐر تک کو "لاتعجل" (جلدی نہ کریں) اور "لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ" (آپ ان پر چوبدار مقرر نہیں کیے گئے) کی تلقین کی گئی۔ نیز اساسی کلیہ سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد: ۴۰) یعنی آپ کے ذمے صرف بات کو کما حقہ پہنچا دینا ہے، اور حساب ہمارے ذمے ہے۔ یعنی حساب اس پہلو سے بھی کہ کون ہدایت پائے اور کون نہ پائے، اور کون جلد پائے اور کون دیر

سے پاٹ دے ، اور حساب اس پہلو سے بھی کہ ہدایت یافتہ اور محرومین ہدایت کی کشمکش کا کب کیا نتیجہ پیدا ہو، کسے کیا کامیابی کب ملے اور کسے کس عذاب سے کب دوچار ہونا ہوگا۔

مذکورہ بالا الفاظِ قرآنی کا مدعا اثرات و نتائج کو تفویض الی اللہ کرنا ہے۔ اس صورت میں ان حدود و شرائط کا پورا تحفظ ہو جاتا ہے جو کارِ دعوت کے لیے دی جا رہی ہیں۔

اَدلے کا بدلا اور صبر پھر فرمایا:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۔

اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچائی جائے۔ اور اگر صبر کرو تو یہ (روّیہ) صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔

دعوت کی ہدایات دیتے ہوئے اس آیت کا بیچ میں آجانا بظاہر عجیب سا لگتا ہے۔ مگر عملی زندگی میں داعیانِ حق کو بعض مواقع ایسے پیش آتے ہیں جن کا چارۂ کار یہ آیت بتاتی ہے۔

اس آیت کا مفہوم کئی مختلف شکلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک سادہ سی شکل یہ پیش آسکتی ہے کہ بسا اوقات ناشائستہ و سنگ دل جاہلوں سے انتہائی نرمی اور خیر خواہی سے بات کرنے کے باوجود ان میں جذباتی ہیجان اور متعصبانہ اشتعال پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض مخالف مذہبی پیشوا بھی اپنے پیروکاروں کو کسی بدسلوکی کے لیے اکسا سکتے ہیں۔ کہیں تو معاملہ محض زبان درازی، بدگوئی یا استہزا تک رُک جاتا ہے اور کہیں ہاتھاپائی، مارپیٹ اور قتل تک جا پہنچتا ہے۔ بعض حالات میں مالی نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ آیت بدلہ لینے کا مساوانی قانونی حق دیتی ہے بشرطیکہ بدلہ لینے کی طاقت موجود ہو۔ مگر بدلہ برابر سرابر کا ہو سکتا ہے زیادتی روا نہیں۔

داعیانِ حق کے ساتھ زیادتی کی ایک صورت وہ ہے جو رجیع اور بئر معونہ کے مقامات میں پیش آئی۔ قاریوں اور واعظوں کو بغیر کسی جرم کے قتل کیا گیا۔ قانوناً ایسی زیادتیوں کا بدلہ لیا جا سکتا ہے۔

تیسری شکل یہ ہے کہ جو قوم مخاطبِ دعوت ہو، وہی میدانِ جنگ میں مقابلہ کرنے کے لیے آموجود ہو۔ ایسی شکل میں میدانِ جنگ میں ان سے بھرپور جنگ کی جائے گی۔ لیکن اگر وہ میدانِ جنگ میں ایسی حرکات کے مرتکب ہوں جس کو روکنے کے لیے اسلام آیا ہے تو ان کے مقابلے پر ویسی حرکات نہیں کی جائیں گی۔ مثلاً غزوۂ احد میں حضرت حمزہؓ اور شہید ہونے والے بعض دوسرے حضرات کا مشرکین نے مثلہ کیا جس

پر پہلے سے کوئی حکم نہ ہونے کی وجہ سے حضورؐ نے بھی ستر مشرکین سے اسی طرح کا بدلہ لینے کا عزم ظاہر کیا۔ اوّل تو یہ تعداد بدلے کے اصول کے لحاظ سے زیادہ تھی۔ دوسرے مکارم اخلاق کے معلّم اور اسلامی تعلیم کے علمبردار صحابہ کو ایسی حرکات سے اللہ تعالیٰ بلند رکھنا چاہتا تھا۔ لہٰذا یہ آیت نازل ہوئی بعض کے نزدیک فتح مکّہ کے وقت نازل ہوئی۔ آنحضورؐ نے اس موقع پر فرمایا کہ اچھا تو پھر ہم صبر ہی کریں گے۔

ایسے حالات میں بھی میدانِ جنگ کے باہر دعوت کا کام جاری رہے گا۔

لیکن ان ساری صورتوں میں ترجیح مسلکِ صبر کو دی گئی۔ کیونکہ مظلوم و صبر کیش داعیانِ حق کی قدر بڑھ جاتی ہے اور دلوں میں ان کے لیے نفوذ کرنا آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ صبر کا مقام بدلہ لینے کے مقام سے بالاتر ہے۔

یہ صبر صرف کارِ دعوت کے لیے مطلوب ہے۔ اگر کوئی قوم جنگ کرنے آئے تو اس کا مقابلہ صبر سے نہیں کیا جائے گا۔ مجرمین کے مقدمے پیش ہونے پر عدالتیں صبر سے کام نہیں لیں گی۔

صبر — ایک مستقل اصولِ دعوت

اب آگے چلتے ہیں:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ، وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ۔

اور صبر کی روش اختیار کرو اور تمہارا صبر صرف اسی ہی کی مدد سے ممکن ہے۔ اور اُن (مخالفین و منکرین) کے طرزِ عمل پر غمزدہ نہ ہو جاؤ، اور جو کچھ چالبازیاں وہ کرتے ہیں ان کی وجہ سے گھٹن میں نہ پڑو۔

اُوپر کی آیت میں بدلہ لینے کے حق کے مقابلے میں صبر اختیار کرنے کو ترجیح دی گئی۔ اور اب پھر معاً اس کے بعد الگ سے بصیغۂ امر کہا جاتا ہے "وَاصْبِرْ" اس کے معنی یہ ہیں کہ صبر کارِ دعوت میں ایک اصول کی حیثیت سے مطلوب ہے۔

اس موقع پر دو ایک صورتیں ایسی لے لی گئیں جن کا چارہ کار صرف صبر ہے۔

بات تو یہ فطری سی ہے کہ اہلِ دعوت کو دعوت کے پھیلنے اور مؤثر ہونے پر خوشی ہو اور جو اُسے نہ مانیں ان کی وجہ سے حزن و ملال لاحق ہو۔ لیکن اُوپر جو ہدایت و ضلالت کے متعلق ایک نکتہ بیان

ہوا ہے اس کی روشنی میں جبلی جذبات پر اسلامی شعور کو غالب آنا چاہیے۔ اس طرح کا حزن و ملال حصولِ مدعا میں تو مفید نہیں ہے، البتہ قوتِ کار کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اِسی طرح مخالفینِ دعوت کی عیاریوں اور مکاریوں پر جو گھٹن محسوس ہوتی ہے اس سے بھی اپنے آپ کو بچانے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ جب صبر کو کارِ دعوت میں ایک اصولی حیثیت حاصل ہے تو وہ چند اور پہلو بھی سامنے آجائیں جو صبر کے متقاضی ہیں۔

ایک تو یہ کہ مخالفین کے غیر شائستہ انداز، استہزاء، مغالطہ انگیزی وغیرہ چیزوں سے داعی زیادہ اثر نہ لے اور اس میں غلط ردّعمل پیدا نہ ہونے پائے۔

دوسرا یہ کہ دعوت کا کام روکنے کے لیے ذہنی، مالی، جسمانی، ایذادہی کی جو صورتیں مخالفین کی طرف سے اختیار کی جائیں ان کو حوصلے سے برداشت کیا جائے اور اپنا کام کسی حال میں ختم نہ کیا جائے۔ اس کی بہترین مثالیں مکی دَور میں ملتی ہیں جبکہ حضورؐ اور صحابہؓ کرام نے انسانی برداشت کی آخری حد تک اذیتیں برداشت کیں مگر خیر خواہانہ اور دردمندانہ اندازِ دعوت کو برقرار رکھا۔

تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی دعوت کے رفتارِ نتائج سے مطمئن نہ ہو اور عاجلانہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنا موقف چھوڑ دے۔ مثلاً:

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کمزور ایمان کے داعیان یہ سوچنے لگیں کہ ہمارے مقاصدِ کار اور طریقِ دعوت میں کوئی کمی ہے کہ کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ باطل تحریکات اور مذاہب کے طریقہ ہائے دعوت کو اختیار کرنے لگیں۔ اِسی چیز سے روکنے کے لیے ہدایت دی گئی کہ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (ہود ۱۱۳) یعنی اہلِ ظلم (جو جادۂ حق سے دُور ہوگئے ہوں) ان کی طرف اپنے ذہنوں اور طریقوں میں ذرا بھی جھکاؤ پیدا نہ ہونے دو۔ کجاکہ تقلید کرنا۔

اب یہ سوچا جاسکتا ہے کہ آدمی کے چاروں طرف بھری دنیا میں اگر باطل تحریکوں کا دور دورہ ہو، اور ان کے داعیان نے اپنی پسند کے کچھ طریقے ایجاد کر لیے ہوں تو آدمی غیر شعوری طور پر ان سے اثر پذیر ہوتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ کیوں نہ کامیابی کے لیے ان کے سے مقاصد اور طریقے اپنا لیے جائیں۔ اس مستقل ذہنی کشمکش سے عہدہ برآ ہونا سوائے صبر کی قوت سے کام لیے ممکن نہیں۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کثیر التعداد مخالفینِ دعوت کچھ مطالبات رکھیں یا پروپیگنڈے کی زبان میں دباؤ ڈالیں کہ اپنے دین اور اپنی دعوت سے کم سے کم فلاں چیزیں حذف کردو یا یہ یہ تبدیلیاں کرلو تو ہم قریب آسکتے ہیں، یا مخالفت و مزاحمت ترک کرسکتے ہیں۔ جیسے کہ:۔

اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْہُ (یونس-۱۵) کا مطالبہ حضورؐ کے سامنے آیا تھا۔ یعنی آپ اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لے آئیں، یا اسی میں مناسب ردّ و بدل کرلیں۔ اسے قرآن میں مخالفین کی خواہشات کا اتباع قرار دے کر سخت وعید سنائی گئی۔ مثبت حکم الٰہی یہ ہے کہ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ (ھود: ۱۱۲) آپ کو جیسا کچھ حکم دیا گیا ہے اس پر جمے رہیے۔ یہ حکم ہر داعی حق کے لیے ہے۔ یہ استقامت صرف صبر کے ہونے ہی سے ممکن ہے۔ آدمی مخالفین کے دباؤ کو برداشت کرے، ان کے بار بار کے مطالبوں کو سنے اور اپنے میں تزلزل نہ آنے دے۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ضلالت زدہ قوموں کے دنیوی جاہ و جلال سے اہلِ دعوت مرعوب ہونے لگیں، اپنے آپ کو کمزور محسوس کریں، اور احساسِ کہتری یا رشک میں مبتلا ہوں۔ تو ایک تو یہ تاثر اس کردار کو کمزور کردیتا ہے جو داعی میں ہونا چاہیے، اور دوسرے دعوت کا علم بلند کرنے کے عظیم مقصد سے توجہات اور قوتوں کا ایک حصہ کٹ کر دولتِ دنیا سمیٹنے میں صرف ہونے لگتا ہے۔ اس خطرے کا سدّباب کرنے کے لیے قرآن نے داعیانِ حق کو ہدایت دی کہ:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْھُمْ زَھْرَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (طٰہٰ ۱۳۱)

تمہاری آنکھیں ان (ضلالت زدہ افراد اور اقوام) کے دنیوی جاہ و ثروت سے مرعوب نہ ہوں جس کی کچھ اقسام ہم نے ان کو دے رکھی ہیں۔

اور

فَلَا یَغْرُرْکَ تَقَلُّبُھُمْ فِی الْبِلَادِ (المومن ۴)

اور مختلف شہروں میں ان کی چلت پھرت تم کو مغالطے میں نہ ڈال دے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے پچھلے سو سال سے ہمارے ہاں مغرب کی دولت اور دنیوی ترقی کو دیکھ دیکھ کر یہ سمجھا جارہا ہے کہ شاید یہ سارا کچھ اس وجہ سے ہے کہ مغرب والوں کا دین یا نظام ہمارے اسلام سے بہتر ہے۔ اور پھر دنیا کے سرمایہ داروں، یہودی اکابر اور بڑی قوموں کے صدروں اور سفیروں کی

جہازوں پر ادھر سے اُدھر آمد و رفت اور ان کی مشاورتیں اور مجلس آرائیاں اور ادارے، پھر ان کی ثقافتی مجالس کی بہاریں، ان ساری چیزوں کا ایک بھاری اثر ذہنوں پر پڑتا ہے۔ حالانکہ جب تبدیلی آتی ہے تو دولت اور ایوان اور مسندیں اور ادارے اور کھیل تماشے سارے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں بلکہ باعثِ مصیبت بنتے ہیں جیسے کہ قرآن میں دنیوی اسبابِ جاہ و جلال کے بارے میں آیا کہ خدا تعالیٰ انہی چیزوں کو اپنے نافرمان بندوں کے لیے ذریعہ عذاب بنانا چاہتا ہے۔ (لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا - توبہ ۵۵)

صبر اگر داعی کے کردار کی بنا ہو تو وہ ان چیزوں سے مرعوب ہونے کے بجائے انہیں عبرت کا سامان سمجھے گا۔ یہ انسانیت کے خلاف طرح طرح کے جرائم اور مظالم میں استعمال ہوتی ہیں۔ داعیِ حق کو حضرت جعفر طیار کے کردار سے سبق لینا چاہیے جنہوں نے نجاشی کے دربار میں مخالفت پر تُلے ہوئے مذہبی پیشواؤں اور درباریوں کے سامنے قرآن کا کلام نقطہ بہ نقطہ اور شوشہ بہ شوشہ سنا دیا۔ اور نمونہ لینا چاہیے عامر بن ربعی سے جنہوں نے رستم کے پُرشکوہ دربار میں داخل ہوتے ہوئے بھی اپنی شانِ بدویت کو بغیر کسی احساسِ کہتری کے برقرار رکھا، اور اس طرح درباریوں کو مبہوت کر دیا۔

میں کہتا ہوں، افراد کو تو چھوڑیے، پوری تہذیبِ مغرب کے پُرشکوہ دربار میں آپ کلمۂ حق کہنے کے لیے حضرت جعفر طیار کے سے ایمان اور ربعی بن عامر جیسی خودی کے ساتھ نمودار ہوں۔ اور اہلِ دولت و ثروت کی ریس میں پڑ کر اپنی توجہات اور قوتوں کو مقصدِ دعوت سے ہٹا کر ضائع نہ کریں۔ دولت اور روزی اور رتبہ افروزی (یعنی سٹیٹس) بنانے میں اگر جانکاہی اور دماغ سوزی کی جائے تو اس میدانِ مسابقت میں کوئی حد نہیں۔ مقصد رکھنے والے صاحبِ دعوت کے لیے اتنا کافی ہے کہ خدا اُسے رزقِ کفاف دیتا رہے، اور اتنا تو بالعموم ملتا ہی ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ خود دعوت کے فروغ کے لیے دولت اور ذرائع و وسائل کی ضرورت واضح ہے۔ اور لوگوں کو زائد کمائی اس مقصد سے کرنی چاہیے کہ وہ انفاق کر کے دعوتی سرگرمیوں کو وسیع تر اور مضبوط تر کریں اور کام کرنے والے زیادہ سے زیادہ افراد کو سنبھالنے کا انتظام کریں۔ البتہ اس کام میں سادگی کو بنیادی معیار ہونا چاہیے۔ ادارات اور انتظامات میں حد سے بڑھی ہوئی آسائشیں اور سہولتیں جمع کرنا غیر ضروری ہے۔ اجتماعی انتظامات جو کچھ بھی ہوں

مردانِ کار کو چاہیے کہ وہ جس دعوت کے وارث بن رہے ہیں، اس کے مورثانِ اوّل کے کیش و مسلک سے اپنے آپ کو بہت دُور نہ لے جائیں۔ ورنہ کئی مثالیں ایسی مل سکتی ہیں کہ داعیانِ حق کی صفوں سے بعض ایسے افراد بچھڑ گئے جنھوں نے اپنے لیے دولت اور STATUS کو بڑھانے کی مسابقت شروع کی۔

بہرحال یہ مقام بھی مضبوط صبر کی صفت چاہتا ہے۔

صبر صرف اللہ کی مدد سے ہے اب تک یہ بات واضح ہو گئی کہ صبر کے زادِ سفر کے بغیر دعوتِ حق کی راہ میں چار قدم چلنا بھی مشکل ہے۔

اگلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ مفہوم واضح ہے کہ صبر کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اور یہ توفیق انہی کو ملتی ہے جو عبادات و طاعات اور اذکار و ادعیہ کے ذریعے اللہ سے اپنا ربط جڑ جاتے ہیں۔

اسی اشارے کی توضیح متصلاً یوں وارد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔	یقیناً اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کریں اور وہ جو احسان کرنے والے ہوں۔

بات صاف ہے کہ اللہ کی معیت و تائید (اور اس کی طرف سے توفیقِ صبر) کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ اہلِ دعوت تقویٰ اور احسان کی خوبیوں سے آراستہ ہوں۔

آیت کی رُو سے اللہ کو داعیان میں دو خوبیاں مطلوب ہیں۔ ایک تقویٰ، دوسری احسان۔ بعض اصحاب کے نزدیک منہیات سے اجتناب کا نام تقویٰ ہے، اور احسان مطلوبات کی راہ میں پیشقدمی کا نام ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ تقویٰ محض احکام و فرائض کی پابندی کا نام ہے، اور احسان کا مطلب اپنے ذوق و شوق کے تحت کسی قدر آگے بڑھ کر عبادات و معاملات کو بہترین پیرایوں میں انجام دینا ہے۔ بعض کے نزدیک تقویٰ کا مفہوم خدا سے تعلق کو درست رکھنا ہے، اور احسان کا مدعا خدا کے بندوں سے اپنے تعلقات و معاملات کو حسن و خوبی سے انجام دینا ہے۔

ان ساری باتوں کو سامنے رکھیں تو خلاصہ یہ ہے کہ داعیِ حق کو عبادات و معاملات کے لحاظ سے بھی، اور ان میں کارفرما روحِ ایمانی کے لحاظ سے بھی دینِ حق کا عملی نمونہ ہونا چاہیے۔ ان کی شخصیتوں

اور کرداروں ہی میں ایک اثر موجود ہو جو فضا پر چھا جائے۔ ہر کوئی محسوس کرے کہ یہ ہیں لوگ نیکی اور شرافت کے خدائی راستے کی طرف بلانے والے۔

حقیقی تقویٰ اور احسان کے بغیر جو لوگ محض دین کا نمائشی خول اپنے گرد آراستہ کر کے نکل کھڑے ہوں، یا لچھے دار تقریروں اور دلفریب طرزِ گفتگو پر سارا بھروسہ کریں، یا محض اپنی تنظیمی قوت کو بڑی چیز خیال کر لیں، یا کسی تنخواہ یا وظیفے کا حق ادا کرنے چلے ہوں، ان کی دی ہوئی دعوت اسلامی تھوڑے بہت اثرات تو شاید دکھا دے، مگر کوئی بڑا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ کجا یہ کہ صریحاً قول و فعل کے تضاد موجود ہوں اور داعیانِ حق کا حال یہ ہو کہ وہ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (صف۔ ۲) کی زد میں آ تے ہوں۔

تقویٰ و احسان صرف اس کا نام نہیں کہ دین کی کم سے کم ضروریات کو کم سے کم لازم حد تک پورا کر دیا جائے۔ "کم سے کم" تو نقطۂ آغاز ہے۔ ان خوبیوں میں پے در پے اضافہ ہونا چاہیے اور اہل دعوت کو اس معیار کی طرف بڑھتا چاہیے جسے حضورؐ اور سابقون الاولون اور جملہ صحابہ نے قائم کر کے دکھا دیا کہ خدا کے دین کو کیا مطلوب ہے۔ تقویٰ و احسان ایسی چیزیں بھی نہیں ہیں کہ ایک بار کسی خاص حد پر پہنچ کر آدمی سمجھے کہ بس اب بات بن گئی۔ جہاں وہ رکے گا، زوال شروع ہو جائے گا۔ تقوے و احسان کی راہ میں مسلسل قدم آگے بڑھنے چاہییں۔

متذکرہ اصول و شرائط کے سامنے دعوتِ اسلامی کا کام کرنے والے لوگ اگر گروہ در گروہ ہر طرف سے اُٹھ کھڑے ہوں ــــ اور عالمِ اسلام میں یہ ہو رہا ہے ــــ تو کوئی وجہ نہیں کہ ملحدانہ مادی تہذیب اور اس کے نظریوں اور نظاموں اور تحریکوں کو شکست نہ دی جا سکے۔ وقت آ رہا ہے جب دینِ مادیت کی جڑیں ہل جائیں گی اور سوچنے کے موجودہ پیمانے یکسر بدل جائیں گے۔ بہر حال تقدیرِ عالم خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی جانتا ہے کہ کب کیا ہونا ہے۔

اختتامی نوٹ :۔ مضمون کے آخر میں چند تجاویز بھی لکھی گئی تھیں۔ ان کو اشاعت کے لیے نہیں دیا گیا۔

پاکستان میں زکوٰۃ کی متوقع آمدنی

جناب ابوالعرفان صاحب

مقالہ نگار پاکستان قومی بنک کے ایک اونچے عہدیدار ہونے کی وجہ سے بنکاری کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں صحیح اعداد و شمار فراہم ہونے کے باوجود انہوں نے پاکستان میں زکوٰۃ کی مد سے متوقع آمدنی کا اندازہ لگایا ہے اگر کوئی صاحب علم اس موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہیں تو ترجمان القرآن کے صفحات ان کے لیے حاضر ہیں۔

پاکستان میں زکوٰۃ مندرجہ ذیل اشیاء و تمسکات پر واجب ہے۔

۱۔ افراد کی نجی بچتیں۔

۲۔ سونا اور چاندی بصورت زیورات وغیرہ علاوہ اس سونے کے جو حکومت کی ملکیت ہے۔

۳۔ وہ رقوم جو بوجہ سرمایہ کاری تمسکات میں تبدیل ہو گئی ہوں مثلاً:۔

ا۔ قومی بچت کی مختلف نوعیتوں کے سرٹیفکیٹ۔

ب۔ نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ کے یونٹس۔

ج۔ تجارتی اداروں کے حصص۔

د۔ انعامی بانڈز۔

۴۔ اموال تجارت (ہر قسم کے)

۵۔ زرعی پیداوار

۶۔ مویشی

۷۔ جواہرات۔

۸۔ معدنیات۔

۹۔ رقوم بشکل

ا۔ بنکوں میں جمع کردہ رقوم۔

ب۔ پراویڈنٹ فنڈ بیلینس۔

ج۔ انشورنس۔

مندرجہ بالا فہرست پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان مدات میں سے ایک بڑی تعداد ایسی اشیا اور تمسکات پر مشتمل ہے جس کی صحیح مالیت کا تعین آج اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ تقریباً وہی ہے جسے فرنگیوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لیے قائم کیا تھا۔ کہنے کو ہمارے یہاں اعداد و شمار مرتب کرنے کے لیے وفاقی حکومت کا ایک بہت بڑا ادارہ موجود ہے لیکن یہ اعداد و شمار اس طرح مرتب کیے جاتے ہیں کہ ان کی بنیاد پر زکوٰۃ کا تعین قدرے ناممکن ہے۔ حکومت کا بجٹ ہو یا پیداوار کے مختلف گوشوارے، بہرصورت نمایاں اور انقلابی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ کم و بیش یہی حال صنعتی اور تجارتی اداروں کی پیداوار، نفع و نقصان اور سرمائے کے حساب کتاب کا ہے۔ انکم ٹیکس کے سلسلہ میں جو اعداد و شمار مختلف طریقوں سے مرتب کیے جاتے ہیں وہ بھی زکوٰۃ کے نقطۂ نگاہ سے کچھ سودمند نہیں۔ لہٰذا اسلامی حکومت کے لیے یہ لازمی ہوگا کہ وہ عوام کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ ایسے جامع گوشوارے مرتب کرے جو لوگ از خود پُر کر کے حکومت کو پیش کریں اور خود ہی اپنی زکوٰۃ کا حساب لگا کر اُسے عاملینِ زکوٰۃ کے سپرد کر دیں۔ عاملینِ زکوٰۃ ان پُر شدہ گوشواروں کو جانچ لیں تاکہ اگر بھول چوک ہو گئی ہو تو اُسے درست کیا جا سکے۔ یہ کہنا کافی ہوگا کہ خدا ترس لوگ اخلاقی نظم و ضبط کے تحت پوری پوری زکوٰۃ ادا کرنا بہتر سمجھیں گے چہ جائیکہ وہ بخل اور جھوٹ سے کام لیں۔ اللہ کی خوشنودی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور آخرت کی باز پُرس اسلامی نظامِ حیات کے ایسے عناصر ہیں جن سے اسلامی حکومت میں کردار نکھرتا رہتا ہے۔ مزید برآں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کے برخلاف اسلامی ضابطۂ حیات میں افراد اور حکومت کے مابین تنافر کے بجائے تعاون کا جذبہ کارفرما ہوگا۔

لہذا فی الحال زکوٰۃ کی کل رقم کا تخمینہ اتنا صحیح نہیں ہوگا جتنا کہ اسے ہونا چاہیے۔ مختلف اعداد وشمار جو ہم نے جمع کیے ہیں ان میں سے بیشتر مرکزی دفتر اعداد وشمار گورنمنٹ آف پاکستان سے ماخوذ کچھ اسٹیٹ بنک آف پاکستان اور کچھ دوسرے ذرائع پر مشتمل ہیں۔ انشاء اللہ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد تمام مطلوبہ اعداد وشمار بآسانی مہیا ہو سکیں گے۔

اب ہم جو کچھ ہمیں میسر آیا ہے اس کی بنیاد پر زکوٰۃ کی مد سے آمدنی کا اندازہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ افراد کی بچت اس مد میں کل رقم کیا ہوگی اس کا تعین تقریباً ناممکن ہے تاہم اس کا تعین حسب ذیل طریقہ سے کیا گیا ہے:

ا:۔ پاک کرنسی کے کل نوٹ جو تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں بتاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۷ء۔	۱۴۴۹٫۱۰ کروڑ روپیہ
ب۔ وہ نقد رقم جو اسٹیٹ بنک اور دیگر بنکوں میں بتاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۷ء موجود تھی۔	۴۱۸٫۰۰ کروڑ روپیہ
ج۔ وہ رقم جو عام افراد کی تحویل میں ہے۔	۱۰۳۱٫۱۰ کروڑ روپیہ
د۔ اس میں سے اس رقم کو وضع کر دیجیے جو صاحب نصاب نہیں ہیں ہمارے خیال میں یہ رقم دو ارب روپے ہو سکتی ہے اور ممکن ہے کہ یہ ڈھائی ارب روپے ہو لہذا تخمیناً ۲۳۱٫۱۰ کروڑ روپیہ مزید وضع کر دیجیے۔	۲۳۱٫۱۰ کروڑ روپیہ
ہ۔ باقی بچی وہ رقم جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔	۸۰۰٫۰۰ کروڑ روپیہ
س۔ زکوٰۃ بشرح ۲½ فی صد۔	۲۰٫۰۰ کروڑ روپیہ

۲۔ سونے چاندی کی سلاخیں اور زیورات و برتن اس ضمن میں صحیح اعداد وشمار کا تعین فی الوقت ناممکن ہے صدیوں سے ہماری خواتین سونے چاندی کے زیورات نہ صرف پسند کرتی ہیں بلکہ انہیں دل وجان سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ رؤسا کے یہاں چاندی کے برتن بھی خاصی تعداد میں ہوتے ہیں۔ ہماری کل آبادی تقریباً ۷½ کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ اوسطاً اگر ایک خاندان میں ۵ افراد ہیں تو پاکستان میں کل خاندانوں کی تعداد ۱½ کروڑ بنتی ہے۔ اوسطاً اگر ایک خاندان کے پاس ایک تولہ سونا ہو تو

کل سونا کی مقدار ۱½ کروڑ تولہ سونا ہوتی ہے جس کی مالیت بشرح -/۶۰۰ روپے فی تولہ مبلغ ۹ ارب روپیہ ہوگی۔

ہم فرض کرتے ہیں تمام سونے چاندی کے زیورات ، برتن یا سلاخیں مبلغ ۹ ارب روپیہ کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تخمینہ میں غیر مسلم اور وہ تمام اصحاب بھی شامل ہیں جو صاحب نصاب نہیں ہیں لہذا ۴ ارب روپیہ اس میں سے وضع کر دیجیے۔ اس طرح اس مد میں پانچ ارب روپے کی رقم بچتی ہے جس پہ زکوۃ بشرح ۲½ فی صد ۵۰۔۱۲ کروڑ بنتی ہے۔

۳۔ قومی بچت کی مختلف اسکیمیں

ا۔ اس میں سب سے پہلے سیونگ سرٹیفکیٹس کو لیجیے، یہ تین قسم کے ہیں

خاص بچت کے تمسکات۔

قومی بچت کے تمسکات۔

دفاعی بچت کے تمسکات۔

یہ تمسکات خاص و عام ہر شخص خریدتا ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری ادارے بھی اپنی بچی ہوئی رقوم کو انہیں مدات پر خرچ کرتے ہیں۔ ان اسکیموں کے ذریعے سے ۳۰ جون ۱۹۷۶ء تک کل رقم ۹۷۰۵۰ کروڑ روپیہ جمع ہوئی۔

ب۔ اس کے علاوہ حکومت پاکستان نے قومی بچت کے حسب ذیل کھاتے بھی کھول رکھے ہیں۔

بچت کھاتے۔

مقررہ میعاد بچت کھاتے۔

خاص بچت کھاتے۔

بونس بچت کھاتے۔

منافع اور بونس بچت کھاتے۔

ان مختلف کھاتوں کے ذریعے ۳۰ جون ۱۹۷۶ء تک کل رقم ۸۶۔۳۰۱۳ کروڑ روپیہ حاصل ہوئی۔

ج۔ نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ یونٹس:۔ یہ بھی حکومت ہی کا قائم کردہ ایک ادارہ ہے جو لوگوں کی بچت سے سرمایہ کاری کے ذریعہ ملکی معیشت کی خدمت انجام دیتا ہے اس مد میں ۳۰ جون ۱۹۷۶ء تک کل رقم ۸۹۔۶۹ کروڑ روپے جمع تھی۔

د- تجارتی اداروں کے حصص:- یہاں ہم صرف ان اداروں کے حصص شمار کریں گے جنہیں باضابطہ طور پر کراچی حصص مارکیٹ میں رجسٹرڈ کرایا گیا ہے۔ ان اداروں کے تمام معمولی حصص کی کل مالیت بازار نرخ کے بموجب ۳۰ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ۲۶۰۰۔۵۳ کروڑ روپیہ تھی۔ صنعت و تجارت ملکی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ بھٹو حکومت کی عاقبت نااندیشانہ حکمتِ عملی کی وجہ سے پاکستان کی معیشت تقریباً تباہ ہوگئی۔ اگر ذرا تدبر سے کام لیا جاتا تو صرف ۲ سال کے اندر یہ رقم دُگنی ہوسکتی تھی۔ سردست ہم صرف اسی رقم کو یعنی ۲۶۰۰۔۵۳ کروڑ روپیہ کی بنیاد پر زکوٰۃ کا حساب لگاتے ہیں۔

ہ- انعامی بانڈز:- انفرادی بچت کو سرمایہ کاری کی طرف راغب کرنے کے لیے حکومت پاکستان نے انعامی بانڈز کی اسکیم چلائی۔ انعامی بانڈز کے ذریعے حاصل کردہ رقم پر جو "سود" حاصل کیا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ انعامات کی شکل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح انعامی بانڈز کی اسکیم "لاٹری" کی دوسری شکل ہے اور پوری قوم کو بلاوجہ جوئے اور سود کی لعنت میں گرفتار کر دیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے ذریعے سے ۳۰ دسمبر ۱۹۷۶ء تک ۷۹۔۸۷ کروڑ روپیہ حاصل ہوئے۔

و- کل زکوٰۃ مع سرمایہ کاری:- اس مد میں ہم نے قومی بچت کی مختلف سکیمیں، قومی بچت کے مختلف کھاتے، نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ یونٹس، تجارتی اداروں کے حصص اور انعامی بانڈز کا ذکر کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے پاکستان میں سرمایہ کاری کا مکمل اندازہ کر لیا ہے۔ عملی اور حقیقی صورت اس سے کہیں وسیع تر ہوگی۔ بہر نوع ہمارے متذکرہ بالا تخمینہ کے بموجب سرمایہ کاری پر کل زکوٰۃ حسب ذیل ہوگی۔

ذیلی مد	کل رقم محل زکوٰۃ
ا- قومی بچت کی اسکیمیں	۹۷،۵۰،۰۰،۰۰۰ روپیہ
ب- قومی بچت کے کھاتے	۱۳۳،۸۶،۰۰،۰۰۰ "
ج- قومی سرمایہ کاری کے یونٹس	۶۹،۸۹،۰۰،۰۰۰ "
د- تجارتی اداروں کے حصص	۲۶۰۰،۵۳،۰۰،۰۰۰ "
ہ- انعامی بانڈز	۷۹،۸۷،۳۰،۰۰۰ "
میزان:	۲۹۸۱،۶۵،۰۰،۰۰۰ "
زکوٰۃ بشرح ۲½ فیصد:	۷۴،۵۴،۱۲،۵۰۰ "

۴۔ اموالِ تجارت | حصولِ زکوٰۃ کی یہ مد مالیاتی اعتبار سے نہایت اہم ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس ضمن میں اعداد و شمار بالکل ناپید ہیں۔ لہٰذا ملک میں اموالِ تجارت کی مالیت کا تعین کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر ہماری پچھلی حکومتوں میں سے کوئی بھی حکومت دین اسلام کے بارے میں ذرا بھی مخلص ہوتی تو وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ بنیادی کام ضرور انجام دیتی۔ ان حالات میں تخمینہ کی خاطر ہم نے ذیل کا طریق کار اختیار کیا ہے۔

آبادی کے اعداد و شمار کی رُو سے ہمارے ملک میں کراچی اور لاہور کو چھوڑ کر پچاس ایسے شہر ہیں جن کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے دس درمیانی قسم کے بڑے شہر ہیں جن کی آبادی ۲ لاکھ سے ۸ لاکھ تک ہے۔ مثلاً راولپنڈی، لائل پور، ملتان، سیالکوٹ، پشاور، اور کوئٹہ وغیرہ۔ ان شہروں میں تھوک اور پرچون کی ایسی دوکانیں جن کے اموالِ تجارت کی مالیت ۳ لاکھ روپیہ اور اس سے زائد ہو، ان کی مجموعی تعداد حسبِ ذیل ہو سکتی ہے:۔

کراچی میں	۲٫۵۰۰ دوکانیں	
لاہور میں	۱٫۰۰۰ "	
دس بڑے شہروں میں	۵٫۰۰۰ "	(۵۰۰ دوکانیں فی شہر)
چالیس عام شہروں میں	۸٫۰۰۰ "	(۲۰۰ دوکانیں فی شہر)

دوکانوں کی کل تعداد ۱۶٫۵۰۰ جنہیں اگر تین لاکھ روپے سے ضرب دی جائے تو ان تمام دوکانوں میں اموالِ تجارت کی کل مالیت ۴۹۵ کروڑ بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ سے کم آبادی والے شہر بھی کافی تعداد میں ہیں۔ تخمینہ کی خاطر مؤخر الذکر شہروں کی دوکانوں کے اموال تجارت کی کل مالیت ہمارے خیال میں ۱۰۵ کروڑ ضرور ہوگی[1]۔ اس طرح پورے ملک میں اموال تجارت کی مجموعی مالیت ۶۰۰ کروڑ روپیہ بنی جس میں اڑھائی فیصد شرح سے کل زکوٰۃ ۱۵ کروڑ روپے ہوتی۔

ہمارا یہ تخمینہ کہاں تک صحیح ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایک چیز سخت پریشان کن ہے کہ جس ملک میں اموالِ تجارت کی کل مالیت ۶۰۰ کروڑ روپیہ ہو اس ملک میں ۱۶ ارب روپیہ کی کرنسی کھا گیا

---

[1] ہمارے نزدیک یہ تخمینہ بہت ہی کم ہے۔

جوانہ ہے؟

۵ - زرعی پیداوار | زرعی پیداوار پر جو زکوٰۃ عائد کی جاتی ہے شریعت میں اُسے عشر کہتے ہیں۔ مالیاتی لحاظ سے زکوٰۃ کا یہ اہم ترین شعبہ ہے۔ وجہ واضح ہے۔ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے تقریباً ۷۰ فیصد افراد کا انحصار زراعت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری کل پیداوار جو تقریباً ۱۶۱۰۰ ارب روپیہ ہے

—— صنعت و حرفت کا حصہ تقریباً ۱۷ ارب روپیہ ہے (یہ اعداد و شمار ۷۵ - ۷۴ سے متعلق ہیں اور حکومت پاکستان کے مرتب کردہ "نیشنل اکاؤنٹس" سے ماخوذ ہیں۔

ا۔ عشر اور نصف عشر کی شرح:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ بارانی زمینوں کی پیداوار نیز ان درختوں کی پیداوار جو اپنی جڑوں سے بغیر بارش وغیرہ کے پانی کھینچ لیتے ہیں۔ اور چشموں (ندی، نالوں، نہروں) سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار پر دسواں حصہ زکوٰۃ (یعنی عشر ۱۰ فیصد) فرض ہے۔ برخلاف اس کے مصنوعی آبپاشی سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار پر بیسواں حصہ (یعنی نصف عشر یا ۵ فیصد) زکوٰۃ فرض ہے۔

"محمد بن عبدالرحمٰنؒ انصاری فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی اور حضرت عمر فاروقؓ کے مکتوب گرامی میں لکھا ہے بارانی زمین جو بارش یا نہروں سے سیراب ہو اور اپنی جڑوں سے پانی کھینچ لینے والے درختوں کی پیداوار پر دسواں حصہ اور اس کھیتی پر جس کو جانور کے ذریعے سیراب کیا جائے بیسواں حصہ زکوٰۃ ہوگی" (کتاب الاموال، امام ابو عبیدہ: ۱۴۱۲)

اس مضمون کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

"بارانی زمینوں پر دسواں حصہ اور رہٹ اور جانوروں کے ذریعے آبپاشی کی جانے والی زمینوں پر بیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔"

ب - زرعی پیداوار کا نصاب:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی اس سلسلہ میں کیا ہیں؟

"حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ وسق کھجوروں سے کم میں زکوٰۃ واجب نہیں"۔ (بخاری و مسلم) (مشکوٰۃ شریف ۱۴۰۲)

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " جو پیداوار

پانچ وسق[1] سے کم ہو اس میں صدقہ (زکوٰۃ) نہیں "۔ (کتاب الخراج: امام ابو یوسف ؒ: ۱۹۵)

ج۔ پھلوں کی پیداوار پر زکوٰۃ:۔ پھلوں کی پیداوار پر زکوٰۃ متعین کرنے کے وہی اصول ہیں جو زرعی پیداوار کے سلسلے میں اوپر بیان کیے جا چکے ہیں، البتہ اس سلسلہ میں حضورؐ نے فرمایا "جب تم (باغات کا) اندازہ لگایا کرو تو تہائی حصہ چھوڑ دیا کرو اور اگر تہائی نہ چھوڑو تو چوتھائی (ضرور) چھوڑ دیا کرو۔ (کتاب الاموال ۱۴۴۸) ۔ مکحول کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تخمینہ لگانے والوں کو بھیجتے تو فرماتے تھے "تخفیف کرنا اس لیے کہ مال (باغات) میں عاریتاً دیا ہوا کھجور کے درخت اور راہ گیروں کا حصہ بھی ہوتا ہے "۔ (کتاب الاموال ۱۴۵۳) - عاریت دیے ہوئے درختوں سے مراد پھلوں کے وہ درخت ہیں جنہیں مالک درختوں کے پھلوں کا سودا کرتے وقت اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے الگ کر لیتا ہے۔

د۔ سبزیوں پر زکوٰۃ:۔ حضرت مجاہد کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سبزیوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے " (کتاب الاموال ۱۵۰۷) ۔ حضرت جعفر بن برقان کہتے ہیں کہ میں نے میمون سے کہا "ان پر جب تک انہیں فروخت نہ کیا جائے، کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، لیکن جب انہیں فروخت کر دیا جائے اور ان کی قیمت دو سو درہم ہو جائے تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ ہو گی " کتاب الاموال، ۱۵۲۲)

س۔ غلّہ کے کھیت یا باغ فروخت کرنے پر اس کی زکوٰۃ کون ادا کرے گا: غلہ اور پھلوں کی پیداوار کی ملکیت پر ایک سال گذرنے کی قید نہیں ہے بلکہ ان پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ پک جائیں۔ لہٰذا اگر خرید و فروخت کھیتی کے تیار ہوتے اور پھلوں کے پک جانے سے قبل طے پاتی ہے تو زکوٰۃ خریدار ادا کرے گا۔ بصورت دیگر زکوٰۃ کی ادائیگی فروخت کرنے والے پر عائد ہو گی۔

ص۔ زرعی پیداوار پر کل زکوٰۃ کا تخمینہ: زرعی پیداوار سے متعلق ان چند ضروری مسائل کا

---

[1] پانچ وسق سے مراد تقریباً ۲۰ من ہے (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ جلد اوّل حاشیہ صفحہ ۳۲۶ مطبوعہ قرآن محل۔ مولوی مسافر خانہ کراچی)۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "زمین سے تھوڑا یا بہت، جو کچھ بھی پیدا ہو اس میں عشر (یا نصف عشر) واجب ہے " حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی بھی یہی رائے ہے۔

ذکر کرنے کے بعد ہم اب اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ زرعی پیداوار کا صحیح تخمینہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ کل زیر کاشت رقبہ کا الگ الگ حساب لگایا جائے ۔ یعنی کتنی زمین بارانی ہے ، کتنی نہری اور ندی نالوں سے سیراب ہوتی ہے ، کتنی مصنوعی آبپاشی کے ذریعہ کاشت کی جاتی ہے ؟ ساتھ ہی ساتھ اس چیز کا علم بھی ہونا چاہیے کہ ان مختلف اقسام کی زمینوں کی کل پیداوار علیحدہ علیحدہ کتنی ہے ؟ افسوس کہ ہماری وفاقی حکومت کے اعداد و شمار کے ڈویژن نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی ۔ مندرجہ ذیل معلومات دوسرے ذرائع سے فراہم ہوئی ہیں :-

اہم فصلیں	قیمت	۱۷۶۲ ۔ ۳۰ کروڑ روپیہ
غیر اہم فصلیں	قیمت	۴۵۶ ۔ ۸۰ " "
کل قیمت		۲۲۱۹ ۔ ۱۰ " "

(ملاحظہ ہو نیشنل اکاؤنٹس برائے سال ۷۵ ۔ ۱۹۷۴ء مرتبہ وفاقی حکومت)

پاکستان کی سالانہ اعداد و شمار کی کتاب برائے ۱۹۷۵ء کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۲ ۔ ۱۹۷۱ء میں کل رقبہ جو زیر کاشت تھا ۰۰۰ ر ۶۰ ر ۱۷ ر ۴۷ ۔ ایکڑ تھا (ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۳۰) ۔ برخلاف اس کے صفحہ ۴۳ پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل زیر کاشت نہری زمین ۷۷ ۔ ۱۹۷۶ء میں ۰۰۰ ر ۱۰ ر ۸۲ ر ۲ ۔ ایکڑ تھی ۔ ان اعداد و شمار کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۶۰ فیصد زیر کاشت رقبہ نہری زمینوں پر مشتمل ہے ۔ باقی ماندہ میں سے ۲۰ فیصد بارانی ہو سکتا ہے ۔ بالفاظ دیگر ۸۰ فیصد رقبہ وہ ہے جس پر عشر عائد ہوتا ہے اور ۲۰ فیصد رقبہ وہ ہے جس پر نصف عشر واجب ہے ۔ مجموعی زکوٰۃ کے تخمینہ کے تعین کے لیے ہم زرعی پیداوار کی کل قیمت کو اسی نسبت سے منقسم کرتے ہیں ۔

مالیت زرعی پیداوار	۱۷۷۵ ۔ ۲۸	کروڑ روپیہ	برائے عشر
مالیت زرعی پیداوار	۴۴۳ ۔ ۸۲	کروڑ روپیہ	برائے نصف عشر
کل مالیت	۲۲۱۹ ۔ ۱۰	کروڑ روپیہ	

لہٰذا عشر اور نصف عشر کی رقم حسب ذیل ہوئی۔

عشر	۱،۷۷،۵۲،۸۰،۰۰۰ روپیہ
نصف عشر	۲۲،۱۹،۱۰،۰۰۰ روپیہ
زکوٰۃ کی کل رقم	۱،۹۹،۷۱،۹۰،۰۰۰ روپیہ

اس طرح زرعی پیداوار پر زکوٰۃ کی کل رقم تقریباً ۲ ارب روپیہ ہوگی۔

۶- مویشی مویشیوں سے متعلق زکوٰۃ کے احکامات سیم وزر اور زرعی پیداوار سے قطعاً مختلف ہیں۔ مال وزر پر چالیسواں حصّہ، زرعی پیداوار پر دسواں اور بیسواں حصّہ ہے، لیکن مویشیوں کے بارے میں نہ صرف شرح نصاب مختلف جانوروں کے لیے الگ الگ ہے، بلکہ حدِ نصاب بھی مختلف ہے مثلاً بکریوں کا نصاب ۴۰ بکریاں اور گائے کا نصاب ۳۰ ہے۔ اونٹوں کے معاملہ میں نصاب صرف ۵ اونٹ ہے۔

اس ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان مویشیوں پر زکوٰۃ معاف ہے جو ذاتی استعمال کے لیے پالے جاتے ہیں۔ مثلاً سواری کے لیے، گھر کے دودھ کے لیے، یا مال برداری کے لیے یا کھیتوں میں ہل چلانے کے لیے۔ اسی طرح وہ جانور جو مصنوعی آبپاشی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں وہ بھی زکوٰۃ سے مستثنٰی ہیں۔

تیسری بات جو اس سلسلہ میں احادیث، آثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور فقہاء کی آراء سے واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ اگر مویشی ریوڑ وغیرہ کی شکل میں برائے افزائشِ نسل پالے جاتے ہوں تو ان پر زکوٰۃ متعین کردہ شرح کے بموجب وصول کی جائے گی۔ لیکن اگر کوئی شخص مویشیوں کی تجارت کرتا ہے تو ایسے مویشیوں پر زکوٰۃ سال ختم ہونے پر لی جائے گی اور اموال تجارت کی طرح ان کی کل قیمت پر ۲½ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

ان ضروری گذارشات کے بعد آیئے دیکھیں کہ مویشیوں سے متعلق جو اعداد دستیاب ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟ حکومت پاکستان کے مرتب کردہ نیشنل اکاؤنٹس برائے سال ۱۹۷۴-۷۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں مویشیوں کی کل مالیت ۹۶۱،۶۰ کروڑ روپیہ ہے۔ ان مویشیوں میں مختلف جانور اور ان کی الگ الگ تعداد کیا ہے اور ان میں کتنے تجارتی اور کتنے غیر تجارتی ہیں،

اس قسم کی کوئی اطلاع ان اعداد و شمار کے سلسلے میں بیان نہیں کی گئی ہے۔ ان حالات میں ہم ان جانوروں کی قیمت کا تخمینہ اندازے ہی سے لگا سکتے ہیں۔ مویشیوں کی کل مالیت اگر مبلغ ۱۹۶۰ کروڑ مان لی جائے تو ان پر زکوٰۃ بشرح ۲½ فیصد مبلغ ۴۹ کروڑ ۴ لاکھ روپے بنتی ہے۔ یہ صرف تخمینہ ہے اور انشاء اللہ صحیح زکوٰۃ اس سے کہیں زیادہ ہو گی۔

۷۔ جواہرات

۸۔ معدنیات اور رکاز

رکاز ان دفینوں کو کہتے ہیں جو گذشتہ زمانوں کے لوگ حفاظت کی غرض سے زمین میں گاڑ دیا کرتے تھے۔ حضرت عمروؓ بن شعیب سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس گری پڑی چیز کے متعلق کیا حکم ہے جو آباد راستہ میں مل جائے۔ حضورؐ نے فرمایا "اس گری پڑی چیز کے متعلق ایک سال تک لوگوں کے اندر اعلان کرتے رہو۔ اس اثنا میں اگر اس کا مالک مل جائے تو اُسے لوٹا دو ورنہ تمہاری ہو گئی۔" پھر اس شخص نے دریافت کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدیم ویرانوں سے جو کچھ ملے اُس کا کیا حکم ہے؟" آپؐ نے فرمایا "اس میں نیز زمین کے مدفون مال میں سے خمس (۱/۵) دیا جائے گا۔" لہٰذا دفن شدہ مال اگر کسی کو مل جائے تو اُس کی کل مالیت کا ۱/۵ حصہ بحیثیت زکوٰۃ نکالنا ضروری ہے۔ اس پس منظر میں علماء کے ایک گروہ نے کانوں سے نکلنے والے مال کو بھی "رکاز" ہی کے زمرہ میں شمار کیا ہے اور ایسے تمام اموال پر خمس کی ادائیگی واجب قرار دی ہے۔

لیکن فقہاء کا ایک دوسرا گروہ معدنیات کو "رکاز" سے قطعاً مختلف چیز قرار دیتا ہے۔ اس گروہ کے خیال میں معدنیات پر صرف زکوٰۃ واجب ہے۔

"ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰنؒ متعدد علماء (صحابہؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ بن حارث کو قَبَلِیَّہ کی کانیں عطا فرمادی تھیں۔ چنانچہ آج تک ان کانوں پر صرف زکوٰۃ ہی لی جارہی ہے۔" (کتاب الاموال ۸۶۳)۔

"عبداللہ بن ابی بکر سے مروی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے کانوں (کی پیداوار) سے زکوٰۃ لی۔" (کتاب الاموال: ۸۶۶)

یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر سے مروی ہے کہ مالک نے کہا: "کان بمنزلہ کھیت ہے اور اس

(کی پیداوار) میں سے اسی طرح زکوٰۃ لی جائے گی جس طرح کھیت کاٹنے پر اس (کی پیداوار) سے زکوٰۃ لی جاتی ہے اور "کان" "رکاز" نہیں ہے۔ "رکاز" تو مٹی کا وہ دفینہ ہے جو بغیر سرمایہ لگائے ہاتھ لگ جائے اور جس کے حاصل کرنے میں کوئی زیادہ مشقت نہیں اٹھانی پڑتی۔

مفکرِ اسلام مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ:۔

"معدنیات کے بارے میں ہمارے نزدیک سب سے بہتر مسلک حنابلہ کا ہے۔ یعنی وہ تمام چیزیں جو زمین سے نکلتی ہیں، خواہ وہ دھات کی قسم سے ہوں، یا مائعات (پٹرول، پارہ وغیرہ) کی قسم سے، ان سب پر ۲½ فیصد زکوٰۃ ہے جبکہ ان کی قیمت بقدر نصاب ہو اور جبکہ وہ پرائیوٹ ملکیت میں ہوں۔ اس مسلک پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی حکومت میں عمل بھی تھا۔ (المغنی لابن قدامہ، ج ۲، ص ۵۸۱)"۔

معاشی نقطۂ نظر سے معدنیات اور مدفون خزانوں میں فرق ہے۔ اوّل الذکر کے حصول میں کافی سرمایہ اور محنت صرف ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے دفن شدہ خزانہ ہاتھ لگنے کی بات ہے۔ اس میں نہ سرمایہ کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ محنت کی۔ لہٰذا معاشی عدل کے بموجب مناسب یہ ہے کہ معدنیات پر ۲½ فیصد زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

ہمارا ملک اللہ کے فضل سے معدنی دولت سے مالا مال ہے لیکن معدنیات کا بیشتر حصہ حکومت کی اپنی تحویل میں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ حکومت نے ان معدنیات کو زمین سے نکالنے اور اُن کی خرید و فروخت کرنے کے لیے مختلف صنعتی اور تجارتی لمیٹڈ کمپنیاں قائم کردی ہیں جس میں عوام کا سرمایہ بھی لگا ہوا ہے اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ معدنیات حکومت کی اپنی تحویل میں ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ تمام معدنیات جو انفرادی ملکیت میں یا لمیٹڈ کمپنیوں کی تحویل میں ہیں ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس طرح ان معدنیات کی کل پیداوار کی مالیت پر ۲½ فیصد شرح سے زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے۔

حکومت پاکستان کے اعداد و شمار کے بموجب ہماری معدنی دولت کی کل پیداوار ۷۵-۱۹۷۴ء میں مبلغ ۷۶ء۹۰ کروڑ روپیہ تھی۔ اس میں پٹرول، سوئی گیس وغیرہ کی رقوم شامل نہیں ہیں۔ لہٰذا ہم اس کل رقم کو محل زکوٰۃ تصور کرتے ہوئے اس پر ۲½ فیصد کے حساب سے ۹۲ء۱ کروڑ روپیہ

کو معدنیات پر زکوٰۃ کا تخمینہ قرار دیں گے ۔

۹ ۔ رقوم بشکل ۔۔ و ۔ بنکوں میں امانتیں (بنک ڈیپازٹس) :۔ اس سے قبل ہم انفرادی بچت کے اس حصہ کے متعلق بیان کر چکے ہیں جس کا تعلق نقدی سے تھا ۔ اب ہم افراد اور تجارتی اور غیر تجارتی اداروں کی بچت اور سرمایہ کاری کے اس شعبہ کے متعلق عرض کریں گے جو یہ ادارے بنکوں میں بحیثیت امانت جمع کرا دیتے ہیں ۔ ایسی تمام رقوم پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے ۔

ہمارے بنکوں میں کل امانتوں کی رقم بتاریخ ۳۰ ، دسمبر ۱۹۷۶ء مبلغ ۳۹ ارب ۲۳ کروڑ اور ۱۸ لاکھ تھی ۔ امانتوں کی یہ کل رقم ان کھاتوں کے بقایا جات کا مجموعہ ہے جو بنکوں میں کھولے جاتے ہیں ۔ یہ کھاتے حکومت کے مختلف ادارے کثیر تعداد میں کھولتے ہیں اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وہ امانتیں جو حکومت کی اپنی ہوں ، زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں لہذا بنکوں کی کل امانتوں کو ۶۰ : ۴۰ کی نسبت سے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور فرض کرتے ہیں کہ ۴۰ فیصد رقم کا تعلق حکومت ، غیر مسلم اور ان لوگوں سے ہے جو صاحب نصاب نہیں ہیں اور یہ کل رقم ۲۷ ء ۱۵۶۹ کروڑ روپیہ بنی ۔ بقیہ ۶۰ فیصد رقم ۹۱ ء ۲۳۵۳ کروڑ روپیہ ہوتی ہے جس کو مندرجہ بالا اصولوں کے تحت محل زکوٰۃ تصور کریں گے جس پر زکوٰۃ ۲½ فیصد شرح کے بموجب مبلغ ۵۸ کروڑ ۸۴ لاکھ اور ۷۷ ہزار روپیہ کے برابر ہوتی ہے ۔

ب ۔ پراویڈنٹ فنڈ بیلنس :۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر تنخواہ میں سے فنڈ کی کٹوتی جبری ہو تو اس قسم کی رقم پر زکوٰۃ صرف اس سال سے لگنا شروع ہو گی جب یہ واپس مل جائے ۔ بالفاظ دیگر اگر ملازمت کی شرائط میں سے یہ ایک شرط ہو کہ فنڈ ایک شرح خاص کے مطابق ہر ماہ کاٹا جائے گا تو ایسے فنڈ پر اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں ہے جب تک کہ یہ کل جمع شدہ رقم واپس نہیں مل جاتی ۔ لیکن موجودہ صورت حال قدرے مختلف ہے ۔ فنڈ جبری ہو یا نہ ہو ، لیکن تنخواہ سے فنڈ کی کٹوتی ضرور ہوتی ہے تاکہ کٹوتی کے مساوی رقم جو ادارہ فنڈ میں دیتا ہے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے ۔ دوئم فنڈ کے عوض قرضہ کی سہولت عام ہو گئی ہے بعض اداروں میں سو فی صد ہے اور کہیں کچھ کم ۔ ان حالات میں فنڈ کے عوض لیے ہوئے قرضے سال گذرنے سے قبل ہی خرچ ہو جائیں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ۔ لیکن اگر قرض لینے والا اس رقم کو سرمایہ کاری میں صرف کرتا ہے یا اسے نقد اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے تو اس رقم پر (بشرطیکہ بقدر نصاب ہو) ہر سال زکوٰۃ

واجب ہو گی - ہم اس مد سے متوقع رقم کو زکوٰۃ کے تخمینہ میں اس لیے شامل نہیں کر سکے کہ متعلقہ اعداد و شمار مہیا نہیں -

ج - انشورنس :- یہاں پر بھی مسئلہ وہی ہے جو پراویڈنٹ فنڈ سے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی اگر انشورنس جبری ہے تو کل رقم واپس ملنے کے بعد ایک سال کی زکوٰۃ نکالنی ہو گی - اور اگر بیمہ خود کرایا گیا ہو تو ہر سال کے خاتمہ پر جتنی رقم انشورنس کمپنی کو دی جا چکی ہو، اُس کل رقم پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے - ایک مسلک یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ اس رقم پر واجب الادا ہے جو نقد موجود ہو اور اگر نہیں تو اس کا فوری حصول یقینی ہو - لہٰذا اکثر احباب بیمہ پالیسی کی اس رقم کو محل زکوٰۃ قرار دیتے ہیں جو کمپنی بیمہ کرانے کی صورت میں لازمی ادا کرتی ہے - عام طور پر اسے (SURRENDER VALUES) کہا جاتا ہے واللہ اعلم بالصواب -

بہر حال اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر بیمہ خود کرایا ہے تو یا تو اس کل رقم پر زکوٰۃ ہر سال ادا کی جائے جو کمپنی کو سال بہ سال دی جاتی ہے یا پھر بیمہ کی ختم شدہ مالیت پر جس کا تعین کمپنی سے کیا جا سکتا ہے، زکوٰۃ ادا کی جائے - اس ضمن میں یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ بیمہ کمپنی کو جو رقوم ادا کی گئی ہیں وہ خود اپنے مرضی سے دی گئیں - اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ایسی رقوم زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دی جائیں پاکستان میں زندگی کے بیمہ کی کل رقم ۳۰ دسمبر ۱۹۷۲ء تک مبلغ ۵ ارب ۱۳ کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ تھی - اگر ہم صرف ۴ ارب روپیہ پر زکوٰۃ کی رقم تخمینہ میں شامل کریں تو انشورنس کی مد سے کم و بیش مبلغ ۱۰ کروڑ روپیہ زکوٰۃ وصول ہوتی ہے -

زکوٰۃ کی کل متوقع رقم مختلف شعبہ جات زندگی، اشیاء، تمسکات پر فرداً فرداً گفتگو کے بعد اب آیئے سب کو جمع کریں تاکہ کل متوقع رقم کا تخمینہ لگایا جا سکے لہٰذا مندرجہ بالا نتائج پر مبنی ذیل کا خاکہ ملاحظہ ہو۔

تفصیلات	رقم جس پر زکوٰۃ محسوب کی جا سکتی ہے	رقم زکوٰۃ
ا - انفرادی بچت	۸،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰	۲۰،۰۰،۰۰،۰۰۰
۲ - سونا چاندی	۵،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰	۱۲،۵۰،۰۰،۰۰۰
۳ - بچت کے تمسکات	۹۷،۵۰،۰۰،۰۰۰	---------
ب - بچت کے کھاتے	۱،۳۳،۸۶،۰۰،۰۰۰	---------

	روپے	روپے
ج - سرمایہ کاری کے یونٹس	۶۹،۸۹،۰۰،۰۰۰	----------
د - تجارتی اداروں کے حصص	۴،۶۰،۵۳،۰۰،۰۰۰	----------
۳ - انعامی بانڈز	۷۹،۸۷،۰۰،۰۰۰	۲۱،۰۴،۱۲،۵۰۰
۴ - اموال تجارت	۶،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰	۱۵،۰۰،۰۰،۰۰۰
۵ - زرعی پیداوار	۲۲،۱۹،۱۰،۰۰،۰۰۰	۱،۹۹،۷۱،۹۰،۰۰۰
۶ - مویشی	۹،۶۱،۶۰،۰۰،۰۰۰	۲۴،۰۴،۰۰،۰۰۰
۷ - جواہرات	----------	----------
۸ معدنیات	۷۶،۹۰،۰۰،۰۰۰	۱،۹۲،۰۰،۰۰۰
۹ - بنکوں میں امانتیں	۲۳،۵۳،۹۱،۰۰،۰۰۰	۵۸،۸۴،۷۷،۰۰۰
ب - پراویڈنٹ فنڈ	----------	----------
ج - انشورنس	۴،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰	۱۰،۰۰،۰۰،۰۰۰

پاکستان میں زکوٰۃ کی کل رقم کا تخمینہ ——— ۳،۶۳،۰۶،۷۹،۵۰۰

مندرجہ بالا تخمینہ چونکہ بیشتر ان اعداد و شمار پر مبنی ہے جو ۷۵-۱۹۷۴ء سے متعلق ہیں اس لیے یہ بات بغیر کسی شک و شبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان میں نظام زکوٰۃ کے نفاذ کے بعد ہماری کل زکوٰۃ کم و بیش مبلغ چار ارب روپے ہو گی جو غریبوں کے حق کی حیثیت سے تونگروں سے لی جائے گی۔ اور محتاجوں میں تقسیم کی جائے گی۔ ہم میں سے بیشتر خود کو غریبوں کے ہمدرد گردانتے ہیں لیکن یاد رکھیے وہ شخص جو غریبوں کا وہ حق جو اللہ نے اُسے دیا ہے غصب کرتا ہے وہ کسی حالت میں بھی غریبوں کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے دین کا یہ اعجاز ہے کہ ارکانِ دین انسان کو روحانی طور پر شاد کام کرنے کے علاوہ اُسے ایسی کسوٹی بھی عطا کرتے ہیں جس سے وہ رہتی دُنیا تک دوست اور دشمن میں تمیز کر سکتا ہے۔ کاش ہم اللہ تبارک و تعالیٰ کے احسانات کو تسلیم کرنے والے اور اُس کا شکر ادا کرنے والے ہو جائیں۔

اسلامی نظامِ تعلیم کا مقصد

پروفیسر محمد سلیم صاحب

[یہ مضمون اسلامی تعلیمی کانفرنس منعقدہ مکہ معظمہ (۳۱ مارچ تا ۸ اپریل ۱۹۷۷ء) میں پیش کیا گیا]

معاشرتی زندگی کا سب سے اہم شعبہ تعلیم ہے۔ آزاد اقوام ملکی دفاع کے بعد تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ معاشرہ میں خاندانی نظام کو اسی وجہ سے اہمیت اور تقدس حاصل ہے کہ اس کے ذریعہ افزائش نسل اور انسانی آبادی کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ لیکن معاشرہ کے ان نو واردوں کو تعلیم کے ذریعہ ہی انسان بلکہ مہذب انسان بنایا جا سکتا ہے۔ قوم کے مخصوص اندازِ فکر اور قوم کی معنویت سے ان کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ خاندان فرد کو وجود خارجی عطا کرتا ہے، تعلیم اسے وجود معنوی بخشتی ہے۔ اسی لیے آزاد اقوام اپنے نظامِ تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے انگلستان کی روزمرہ کی زندگی مختل ہو گئی تھی۔ انگریز قوم نے تعلیم کے قابل پانچ سال سے زائد عمر کے بچوں کو آسٹریلیا بھیج دیا تھا تاکہ وہاں ان کی تعلیم بلا خلل جاری رہے۔

دوسرے علوم کی طرح فنِ تعلیم نے بھی بہت وسعت اختیار کر لی ہے۔ شعبۂ تعلیم میں نئی نئی شاخوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ مثلاً مقصدِ تعلیم، نفسیاتِ تعلیم، تعلیم کی معیار بندی، نصاب تعلیم، طریق تدریس، امتحانات و اسناد، انتظام شعبۂ تعلیم وغیرہ۔ تعلیم کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ آرٹس کی تعلیم، سائنس کی تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم، زرعی تعلیم، غیر درسی تعلیم، کھیل اور ورزش وغیرہ۔ مفکرین نے تعلیم کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا ہے۔ نئے نئے افکار پیش کیے ہیں۔ نئے نئے تجربات کیے ہیں۔ اس کے بعد سے تعلیم کی

بعض شاخوں نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ انہوں نے فنِ تدریس کے لیے اصول و ضوابط خذ کیے ہیں۔ یہ سب تحقیقات اور تجربات اپنے مقام پر قابلِ قدر ہیں۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شعبہ تعلیم میں اصل اہمیت مقصد تعلیم کو حاصل ہے۔ مقصد تعلیم کی روشنی میں دوسرے تمام ذیلی شعبے اپنی کارکردگی کے خطوط متعین کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا ذیلی شاخیں طریقۂ کار سے بحث کرتی ہیں مقصد کار سے بحث نہیں کرتیں۔ ظاہر ہے طریقۂ کار کو مقصد کار پر فوقیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ ایک طریقۂ کار دوسرے طریقۂ کار سے افضل ہوتا ہے۔ چونے اور اینٹ کی عمارت مٹی اور گارے کی عمارت سے بہتر ہوتی ہے۔ آر سی سی کی عمارت چونے اور اینٹ کی تعمیر سے بھی افضل ہوتی ہے۔ یہ سب درست ہے۔ لیکن یہ سوال کہ عمارت کیا بنے؟ سینما بنے، میکدہ بنے، مدرسہ بنے یا گھر بنے؟ یہ سوال طریقۂ کار کی بحث سے حل نہیں ہو سکتا۔ فنی اور تکنیکی معلومات مقصد کا تعین کرنے میں ہرگز ممد و معاون ثابت نہیں ہوتیں۔

ہر معاشرہ کا ایک محرک اعلیٰ ہوتا ہے۔ ہر قوم کا ایک مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ جو قوم کے افراد کے دل و دماغ میں رچا بسا ہوتا ہے۔ ہر قوم اپنے نونہالوں کو مقصدِ حیات کی تعلیم خود دیتی ہے۔ کسی دوسری قوم سے مقصدِ حیات، یا مقصد تعلیم مستعار لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فنی اور امدادی معلومات دوسری اقوام سے حاصل کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن فنی اور امدادی معلومات حاصل کرنے کی خاطر دوسروں کا مقصدِ حیات قبول کر لینا قومی خودکشی کے مترادف ہے۔ کوئی ہوش مند قوم اس اقدام کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ قوم کا تصورِ حیات، اس کی روایات اور اس کی اجتماعی ذہنیت اس کے تعلیمی گہواروں میں تشکیل پاتی ہیں۔ اس لیے جرمن اپنی نئی نسلوں کو فرانک فرٹ اور بون میں، فرانسیسی پیرس اور سوربون میں، انگریز آکسفورڈ اور کیمبرج میں، امریکی پرنسٹن اور ہارورڈ میں، اور روسی ماسکو اور خیف میں تعلیم دلاتے ہیں۔ یہ بات کبھی سننے میں نہیں آتی کہ طلبہ نیویارک سے ماسکو حصولِ علم کے لیے گئے ہوں یا ماسکو سے نیویارک۔ آزاد قومیں تو اپنے علمی ورثہ اور تاریخ کی تدوین میں بھی غیروں کی شرکت گوارا نہیں کرتیں۔ اسرائیل نے یہودی دائرۃ المعارف تیار کرائی تو مسیحی محققین تو کجا غیر صیہونی یہودی محققین کو بھی شرکت کی اجازت نہیں دی۔ آزاد قوموں کے ذہن میں مقاصد کی اہمیت سب سے اعلیٰ اور مقاصد کا شعور سب سے بالا رہتا ہے۔

قدیم زمانہ سے علماء اور حکماء تعلیم کا مقصد متعین کرنے کی کوششوں میں مشغول ہیں۔ مختلف لوگوں نے تعلیم کے مختلف مقاصد بیان کیے ہیں۔ ذیل میں ہم دو مفکرین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یونان کا مشہور فلسفی ارسطو لکھتا ہے کہ تعلیم کا مقصد افراد کو بہترین شہری بنانا ہے۔ ماہرینِ تعلیم کے ایک گروہ میں آج تک یہ مقصد مقبول ہے۔ ارسطو یونان کی شہری ریاست اثینیہ (ATHENS) کا باشندہ تھا۔ یونان کے ہر بڑے شہر کی جداگانہ ریاست تھی۔ اکثر یہ ریاستیں باہم دست و گریباں رہتی تھیں۔ اس پس منظر میں ریاستی وفاداری اور فرمانبرداری کی وہاں بے حد اہمیت تھی۔ اس ماحول میں ارسطو کے نزدیک بھی فرد کی اوّلین حیثیت اُس کا شہری ہونا ہے۔ فی الحقیقت فرد ایک مستقل بالذات اکائی ہے، اس کی انفرادی حیثیت اجتماعی حیثیت سے ہرگز فروتر نہیں ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ارسطو کے نظریہ میں تکمیلِ شخصیت جیسے تصورات مفقود تھے بلکہ اس کی فکر کلیت پسندی (TOTALITARINISM) کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔

جدید یورپ میں آدم اسمتھ نے تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ اس کے ذریعہ ایک فرد کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ قومی دولت میں اضافہ کرے اور قومی پیداوار بڑھائے۔ اشتراکی ممالک میں یہ تصورِ تعلیم بہت مقبول ہے۔ وہاں تعلیم کو سرمایہ کاری (INVESTMENT) کے تحت رکھا گیا ہے۔ وہاں انسان کی حیثیت محض ایک معاشی عامل کی ہے۔ یہ شہریت سے بھی محدود تر اور فروتر تصور ہے۔ یہاں انسان مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس کی انفرادی اہمیت کچھ نہیں۔ انفرادی آزادی اور تکمیلِ شخصیت کے تصورات وہاں کی تعلیم میں راہ نہ پا سکے۔ ان مثالوں کا مطالعہ یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ تعلیم کے مختلف مقاصد اپنے مخصوص ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان میں آفاقیت نہیں ہوتی۔ تنگ نظری اور یک رُخا پن ان میں صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ البتہ اس جائزہ سے ایک اہم سبق ضرور ملتا ہے۔ وہ یہ کہ تعلیم کا مقصد متعین کرنے سے قبل انسان کا صحیح تصور قائم کرنے اور اس کی حیثیت کا تعین کرنا حد درجہ ضروری ہے۔ تصورِ انسان جس قدر ناقص اور محدود ہوگا، مقصدِ تعلیم بھی اسی قدر تنگ اور محدود ہوگا۔

انسان کا صحیح تصور پیش کرنا اور اس کی صحیح حیثیت متعین کرنا بہت دشوار مسئلہ ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا جو تصور اور جو حیثیت کسی معاشرہ میں معروف ہوتی ہے، وہاں کے حکماء اسی کو بنیاد بنا کر اپنا فلسفۂ تعلیم مرتب کر لیتے ہیں جیسا کہ قدیم یونان اور جدید یورپ کی مثالیں واضح کرتی ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی حیثیت متعین کرنے کا کیا طریق کار ہو؟ مفکرین اپنے دعوے کس بنیاد پر پیش کرتے

ہیں؟ کیا ان دعووں کے پس پشت کوئی ٹھوس عقلی ثبوت بھی موجود ہے؟ ان وقتی اور ہنگامی وعدوں کی قدر و قیمت آفاقی نقطۂ نظر سے کیا ہے؟ پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل جس طرح عالم مادیات میں حقیقت اور صداقت کا ادراک کر لیتی ہے کیا عالم معنویت میں بھی صداقت کا صحیح ادراک کر لیتی ہے؟ اگر وہ یہ استعداد رکھتی ہے تو پھر وہ متفق علیہ نتائج پیش کرنے سے کیوں قاصر ہے؟ جس نے بھی فلسفیانہ افکار کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ ان سوالوں کے جوابات اثبات میں نہیں دیئے جا سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا تصور قائم کرنا اور اس کی حیثیت متعین کرنے کا کام... عقل انسانی کی دسترس سے باہر ہے۔ انسان ایک روحانی مخلوق ہے۔ اور بقول کانٹ عالم ارواح میں عقل کے پر جلتے ہیں انسان کی حقیقت کا علم، اس کائنات کا علم اور ماورائے کائنات کا علم عقل کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میدان میں عقل کے تمام دعوے محض ادعا ہیں۔ جن کی پشت پر کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ حکماء اور فلاسفر نے اس میدان میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور انسانیت کے قافلے کو صدیوں سے گمراہی کے رستہ پر بھٹکنے کے لیے چھوڑ گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل یا بالفاظ دیگر فلسفہ اور سائنس کو حریم ذات انسانیت میں اگر بار حاصل نہیں ہے اور وہ انسان کی صحیح حیثیت متعین کرنے سے عاجز ہے تو پھر اس دشواری کا حل کیا ہے۔ اس کا حل صرف مذہب کے پاس ہے۔ قرآن مجید اس مشکل کا حل یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالے نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے بعض برگزیدہ بندوں کو وحی کے غیر معمولی علم سے نوازا۔ جو حریم کبریا سے براہ راست نازل شدہ یقینی علم ہے۔ ان کو ان تمام اُمور کی تعلیم دے دی جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں، مگر جن کا جاننا حیاتِ ارضی بسر کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ملک اور ہر قوم میں ایسے انبیاء علیہ السلام مبعوث فرمائے جنہوں نے وحی کا علم عام کر دیا۔ جس کے ذریعہ انسانیت فلاح و کامرانی کے صحیح تصورات سے آشنا ہوئی۔ تعلیماتِ وحی کی آخری اور مکمل شکل قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو تمام انسانی مسائل اور مشکلات کے لیے شاہ کلید ہے۔

قرآن مجید بتاتا ہے کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور نائب کی ہے۔ دوسری تمام حیثیتیں اس سے ماخوذ اور مستنبط ہیں۔ ضروری ہے کہ اس عظیم الشان منصبِ خلافت کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں چند نکات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱ - مغربی مفکرین نے انسان کو اعلیٰ درجہ کا حیوان قرار دیا ہے - زندگی کا مقصود ان کی نگاہ میں حیوانی خواہشات کی بے محابا تکمیل ..... اور نمود و نمائش کے مظاہرات ہیں۔ مغربی تہذیب و معاشرت کے یہی دو بنیادی اصول ہیں - ظاہر ہے اس کے بعد مغربی معاشرہ میں حیوانیت اور بہیمیت کا غلبہ روز افزوں ہوتا جا رہا ہے - یہی وہ بنیادی غلطی ہے جس کے اثرات بہت دُور رس نکلے ہیں۔

اس کے برخلاف وحی الٰہی نے جو علم عطا کیا ہے، اس کے مطابق انسان فی الحقیقت ایک روحانی مخلوق ہے - یہ جسم روح کو بطور آلہ کے ملا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنی کارکردگی اور حسنِ عمل کا مظاہرہ کرے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین جسمانی ساخت عطا کی ہے - بہترین ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے نوازا ہے - تاہم اصل اہمیت جسم کو نہیں بلکہ روح کو حاصل ہے - روح جسم میں حاکمِ اعلیٰ ہے - جسمانی اور فکری تقاضوں کو ظاہر ہونے کے لیے روح کی پختگی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے - جب تک کسی کام پہ دل تیار نہ ہو وہ کام عمل میں نہیں آسکتا۔

۲ - مغربی مفکرین کہتے ہیں کہ دنیا کے معاندانہ ماحول میں انسان ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے - وہ انسان اور کائنات کے درمیان کلی مغائرت تسلیم کرتے ہیں - اور کائنات میں انسان کی تنہائی پہ ترس کھاتے ہیں - انسان کا کام ان کی دانست میں یہ ہے کہ وہ فطرت کی دشمن قوتوں پہ قاہرانہ تصرف کرے۔

اسلام بتاتا ہے کہ انسان اور یہ جہان دونوں ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں - دونوں کے درمیان دشمنی اور مغائرت نہیں بلکہ توافق اور سازگاری ہے - دنیا میں بھیجنے سے انسان کی استعدادوں —— فکری، عملی، اخلاقی اور رُوحانی —— کو بروئے کار لانا مقصود ہے - استعدادوں کو پروان چڑھانے کے لیے یہ رنگ برنگ کی دنیا بہترین میدان عمل اور بہترین مہمیز عمل ہے - دنیا کی ان گنت نعمتوں کے سامنے انسان کا طرزِ عمل قاہرانہ یا فاتحانہ نہیں بلکہ امانت دار کا سا ہے - مومن انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت تصور کرتا ہے اور اس احساس کے ساتھ استعمال کرتا ہے کہ ایک روز مالک حقیقی کے حضور ان سب کا حساب دینا ہوگا - غیر ذمہ دارانہ اور من مانے طریقے پر استعمال کرنے کے بجائے وہ ان کا جوابدہی کے احساس کے تحت تصرف کرتا ہے - اس سے ذمہ دارانہ طرزِ عمل پیدا ہوتا ہے۔

۳ - انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے - خلیفہ جانشین اور نائب کو کہتے ہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک قسم کی خود مختاری عطا فرمائی - جو دوسری کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔

اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو فکر و فہم کی قوتیں دیں ۔ بھلائی اور برائی کی تمیز عطا کی ۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی بخشی ۔ تصرف اور استعمال کے اختیارات عطا کیے ۔ دوسری تمام مخلوقات پر فوقیت بخشی ۔ زمین و آسمان کی تمام قوتوں کو اس کے لیے مسخر کر دیا ۔ انعامات اور عطیات کی یہ بارش اس لیے کی تاکہ انسان دنیا میں حسنِ عمل کا مظاہرہ کرے ۔

لیکن انسان کو مطلق آزادی اور کامل اختیار حاصل نہیں ہے ۔ خلیفہ کا لفظ غمازی کر رہا ہے کہ نائب کو مالک کے تفویض کردہ اختیارات اُس کی وحی کے مطابق استعمال کرنے ہیں ۔ تمام صلاحیتوں کو مالک کی مرضی پورا کرنے میں اخلاص کے ساتھ صرف کرنا ہے ۔ مزید برآں نیابت کا تصوّر اس امر کی جانب بھی واضح اشارہ کر رہا ہے کہ اختیارات اور تصرفات کا حساب ایک روز انسان کو اپنے مالک کے سامنے پیش کرنا ہوگا ۔

۴ ۔ نائب کو مالک کی مرضی اور منشا معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اس کی روشنی میں عمل پیرا ہو ۔ زندگی کی پیچ پیچ راہوں میں حق و باطل ، صحیح و غلط ، جائز و ناجائز رویہ میں تمیز ہونا ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصی انتظام فرمایا کہ اپنے مخصوص بندوں کو ــــ انبیاء کرام علیہم السلام ــــ انسانوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا ۔ ایسے رہنما ہر ملک اور ہر قوم میں آئے ۔ انہوں نے مالک کی مرضی اور حقیقت کا صحیح علم انسانوں کو بتایا ۔ جاہلیت اور اسلام کا فرق واضح کیا ۔ عملاً دنیا میں اسلامی معاشرہ برپا کیا ۔ صراطِ مستقیم لوگوں کو دکھائی ۔

خلافت بالقوہ تو تمام بنی نوع آدم کو حاصل ہے ۔ تمام انسان اس کی دی ہوئی نعمتوں کو استعمال کر رہے ہیں ۔ لیکن خلافت فی الحقیقت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو ان نعمتوں کو منشائے خداوندی کے مطابق استعمال کر رہے ہیں ۔ جو مقاصدِ خلافت کو اخلاص سے پورا کر رہے ہیں ، جو سند کامیابی صرف اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔

۵ ۔ تصوّرِ خلافت کی بنا پر اخلاقی اور روحانی قدروں پر مشتمل ایک معاشرہ قائم ہوتا ہے ۔ جس میں تمام بنی آدم ایک کنبہ کے افراد قرار پاتے ہیں ۔ اسلام پیدائشی طور پر ان کے درمیان کسی اونچ نیچ کو تسلیم نہیں کرتا ۔ وطن ، نسل ، رنگ اور لسان کے اختلافات سے شرف انسانیت اور بزرگی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ۔ فضیلت اور بزرگی کا معیار حسنِ عمل ، حسنِ کردار اور حسنِ اخلاق میں ہے ۔ کوئی

مادی عنصر یا خلقی صفت شرف انسانیت میں نہ کمی کر سکتی ہے نہ اضافہ۔ اس اعلیٰ معیار انسانیت کو اسلام کی اصطلاح میں تقویٰ کہتے ہیں۔ اس معیار نے مادہ پرستی کے تمام تصورات پاش پاش کر ڈالے۔ کالے اور گورے اعلیٰ نسل اور کم اصل کے تمام وصفی تصورات کو ختم کر ڈالا۔ مجرد عقل اس اعلیٰ معیار تک پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔ آج جہاں کہیں اور جس قدر یہ تصور جلوہ گر ہے، وہ سب وحی الٰہی کا فیضان ہے۔

۶۔ یہ دنیا انسان کے لیے دارالامتحان ہے۔ حسنِ عمل کے مظاہرہ کی جگہ ہے۔ مہلتِ عمر مدتِ امتحان ہے۔ تصرفات اور اختیارات کی آزمائش ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان حسنِ عمل کا مظاہرہ کرے۔ تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو امانت جان کر ہدایت الٰہی کے مطابق استعمال کرے۔ اس صورت میں یہ عمل عبادت بن جاتا ہے۔ قربِ خداوندی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس سے حیوانی خواہشات کا اظہار بھی ہدایت الٰہی کی روشنی میں ہوتا ہے۔ خود انضباطی کی عادت پڑتی ہے۔ زندگی اگر اس طرح بسر ہو تو پھر وہ عبادت ہے۔ عظیم منصبِ خلافت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس تصور کے تحت دنیا کے کاروبار میں مصروف رہنے کے باوصف انسان کے اندر ایک قسم کی رفعت اور بے لوثی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بڑی حد تک ادنیٰ جذبات کو دبائے رکھتی ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کا اخلاقی اور روحانی تصور ہے جس سے عقل کے پرستار اور دنیادار قسم کے لوگ بیگانہ ہیں۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کی کائنات کا دائرہ لامحدود ہے۔ اس کا ایک جزو یہ ہماری دنیا ہے۔ اور اس کے گردوپیش کی کائنات ہے۔ قریب ہونے کی وجہ سے اس کو دنیا کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ مرنے کے بعد ظاہر ہوگا۔ بعد میں ظاہر ہونے کی وجہ سے اس کو آخرت کہتے ہیں۔ اسلام تسلسل حیات کا قائل ہے۔ موت زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ تبدیلی کا مرحلہ ہے۔ آخرت کی زندگی دنیاوی زندگی کی تکمیل اور نتیجہ ہے۔ گویا دنیا کی زندگی تیاری کی زندگی ہے جس کے نتائج عقبیٰ میں ظاہر ہوں گے۔ کامیابی وہ ہے جو آخرت میں ملے گی۔ ناکامی بھی وہی ہے جو آخرت میں حاصل ہوگی۔ مہلتِ عمر ختم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ انسانوں کو اپنے حضور طلب کرے گا۔ وہاں انعامات اور اختیارات کا محاسبہ ہوگا۔ کامیاب ہو جانے والوں کو خدا کی رضا کے نتیجے میں جنت ملے گی اور ناکام ہو جانے والوں کو سزا بصورت دوزخ ملے گی۔

آخرت پر ایمان لانے سے انسانی زندگی کے رنگ ڈھنگ، طور طریقے یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اعمال اور افعال دنیا میں ایک خاص سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اعمال جن کا نتیجہ آخرت میں اچھا نکلے گا وہ

محمود بن جاتے ہیں اور وہ اعمال جن کا نتیجہ آخرت میں بُرا نکلے گا وہ مذموم بن جاتے ہیں۔ آخرت کی جوابدہی کا یقین انسان کو منضبط بنا دیتا ہے۔ بغیر جبر و نگران کے وہ خود ہی نیک روش اختیار کر لیتا ہے۔ آخرت کی معرفت مجرد عقل سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مغربی حکماء اور فلاسفہ نے عدم علم کو عدم وجود پر قیاس کر کے آخرت کا انکار کر دیا۔ جس کے بعد سے مغربی اقوام کی زندگی غلط راہوں پر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔

اب ذرا نظریہ خلافت کے عطا کردہ تصوّرِ انسان اور رائج مغرب میں رائج تصوّرِ انسان پر تقابلی انداز میں ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ مغربی مفکرین انسان کی صورت کشی معاشرہ کے پس منظر میں کرتے ہیں۔ معاشرہ میں کارفرما عوامل تغیر پذیر ہیں۔ اس لیے وقتی اور ہنگامی نظریات کے زیرِ اثر ان کا تصورِ انسان بھی متغیر ہوتا رہتا ہے۔ مزید برآں یہ تصوّر یک رُخا بھی ہے اور ناقص بھی ہے۔ ان بنیادی نقائص کی وجہ سے مغربی معاشرہ میں انتشار ہے۔ عائلی زندگی مختل ہے۔ معاشرہ میں طبقاتی جنگ برپا ہے۔ نظریات میں تصادم ہے اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اغراض پرستی اور تنگ نظری کا دور دورہ ہے۔

اسلام نے انسان کا تصوّر خلیفۃ اللہ فی الارض کا پیش کیا ہے۔ اسلام انسان کو کائنات اور ماورائے کائنات کے پس منظر میں دیکھتا ہے۔ اسلام کے سامنے ازل سے لے کر ابد تک پوری انسانیت ہے اور پوری تاریخ ہے۔ زمان و مکان میں قائم ہونے والے تمام معاشروں اور قوموں پر یہ تصوّر حاوی ہے۔ یہ تصوّر کائنات کو اور عالمِ انسانیت کو ایک وحدت کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اسلامی تصورات کا اہم امتیاز توحید ہے۔ تصورِ خلافت مختلف وحدتوں کو جمع کرنے والا ہے۔ کائنات اور انسان ہم آہنگی کے ساتھ ایک بلند تر مقصد کے لیے کوشاں ہیں۔ یہاں انسان مادیت سے بلند تر ہو کر اخلاقی اور روحانی رفعتوں کو چھوتا ہے۔ روحانی ترقی کے لیے یہاں لامحدود میدانِ عمل موجود ہے۔ یہ بے حد عمیق اور بے حد وسیع تصوّر ہے۔

(باقی)

رسائل ومسائل

یہودیوں کی ناپاک سازشیں اور امریکہ

سوال :۔ ۱۔ اسرائیلی وزیراعظم بیگن نے اپنے دورۂ امریکہ کے فوراً بعد حال ہی میں تین غیر قانونی یہودی بستیوں کو دریائے اُردن کے مغربی کنارے پر قانونی حیثیت دی ہے۔ مزید برآں بیگن کی حکومت تین اور نئی بستیاں مغربی کنارے پر بسا رہی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا ردِ عمل کیا ہے؟

۲۔ مسجد اقصیٰ کی دیواروں کے نیچے اسرائیل اب تک کھدائی جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس سے مسجد کو سخت خطرہ لاحق ہے۔ اس سلسلہ میں رابطہ عالم اسلامی کا بیان آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس بارے میں آپ بھی اظہار خیال فرمائیں۔

جواب :۔ ۱۔ اس معاملے میں میرا ردِ عمل یہ ہے کہ امریکی حکومت اگر انصاف اور اخلاق کے تمام اصولوں کو نظر انداز کر کے یہودیوں کی بے جا حمایت اور امداد و اعانت کرنے پر تُلی ہوئی نہ ہوتی تو اسرائیل کبھی اتنا جری و بے باک نہ ہو سکتا تھا کہ پے در پے ایک سے ایک بڑھ کر ڈاکہ زنی اور غصب و ظلم کے جرائم کا ارتکاب کرتا چلا جاتا۔ اس لیے میں اصل مجرم امریکہ کی بے ضمیری کو قرار دیتا ہوں جسے ساری دُنیا کے سامنے اس جرائم پیشہ ریاست کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے ادنیٰ سی شرم تک محسوس نہیں ہوتی۔ امریکہ یہودیوں سے اس حد تک دبا ہوا ہے کہ اسرائیلی وزیراعظم کی آمد کے موقع پر یہاں کے مذہبی پیشوا اور بااثر لیڈر امریکی صدر پر ہجوم کر کے آتے ہیں، بیگن کی پذیرائی کے لیے اس پر دباؤ ڈالتے ہیں اور اس کو درپردہ ہی نہیں اشاروں کنایوں میں یہ احساس بھی دلا دیتے ہیں کہ جسے امریکہ کا صدر بننا ہو وہ یہودی ووٹوں کا محتاج ہے۔ اس پس منظر میں انسانی حقوق اور اخلاق و انصاف کے دعویدار جمی کارٹر صاحب بیگن کے اس انتہائی بے شرمانہ بیان

کو شیر مادر کی طرح نوش فرما لیتے ہیں کہ دریائے اردن کے مغربی جانب کا فلسطین، جو ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں سے چھینا گیا تھا وہ مقبوضہ (OCCUPIED) علاقہ نہیں ہے بلکہ آزاد کرایا ہوا (LIBERATED) علاقہ ہے اور یہ ہماری میراث ہے جس کا وعدہ چار ہزار برس پہلے بائیبل میں ہم سے کیا گیا تھا اس لیے ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔" یہ کھلی کھلی بے حیائی کی بات امریکی حکام اور عوام سب کے سب سنتے ہیں اور کوئی پلٹ کر نہیں پوچھتا کہ بائیبل کی چالیس صدی قدیم بات آج کسی ملک پر ایک قوم کے دعوے کی بنیاد کیسے بن سکتی ہے اور ایسی دلیلوں سے اگر ایک قوم کے وطن پر دوسری قوم کا قبضہ جائز مان لیا جائے تو نہ معلوم اور کتنی قومیں اپنے وطن سے محروم کر دی جائیں گی۔

۲- مسجد اقصیٰ میں جو کھیڑ پچھاڑ یہودی کر رہے ہیں، اور جو کچھ وہ الخلیل میں مسجد ابراہیمی کے ساتھ کر چکے ہیں، اس کی کوئی روک تھام بیانات اور قراردادوں اور اقوام متحدہ کے فیصلوں سے نہیں ہو سکتی۔ یہودی یہ سب کچھ طاقت کے بل پر کر رہے ہیں اور وہ طاقت اس کو امریکہ ہم پہنچا رہا ہے۔ جب تک ہم امریکہ پر یہودیوں کے دباؤ سے بڑھ کر دباؤ ڈالنے کے قابل نہ ہو جائیں، اس ڈاکہ زنی کا سلسلہ نہیں رک سکتا۔

ضروری تصحیح

تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۲۳۹، سطر ۷ تا ۹
اور ترجمۂ قرآن، صفحہ ۱۴۷، سطر ۱۳ تا ۱۵
کی موجودہ عبارت کو حسب ذیل عبارت سے تبدیل کر دیا جائے:

"اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہلِ علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔"

مطبوعات

برنا باس کی انجیل (اُردو)

مرتب : برنا باس ۔ مترجم آسی ضیائی

صفحات : ۲۸۶ طباعت و کتابت عمدہ آفسٹ

کاغذ ۔ عمدہ سفید ۔ قیمت : ۱۳/۵۰ روپے

شائع کردہ : اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ۔

برنا باس حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے ۔ انہیں حضرت مسیح علیہ السلام سے براہ راست مستفید ہونے کا موقع ملا ۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے جو تعلیمات انہوں نے حاصل کیں ، انہیں ایک مجموعہ کی شکل میں اکٹھا کیا جو بعد میں انجیل برنا باس (BERNABAS GOSPEL) کے نام سے مشہور ہوئیں ۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے دوسرے تمام حواریوں کے برعکس برنا باس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کو براہ راست اُن سے روایت کیا ہے ۔ انجیل برنا باس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ برنا باس کو حضرت مسیح کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی حاصل ہوا ہے ۔ انجیل برنا باس میں توحید باری تعالیٰ کے بارے میں واضح تعلیمات ملتی ہیں ، شرک و بت پرستی کی جا بجا مذمت پائی جاتی ہے اور نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں روشن بشارتیں درج ہیں ۔ یہ کتاب انجیل چونکہ مروجہ مسیحی مذہب کی تعلیمات کی یکسر تکذیب کرتی ہے اور اُن کی اصلیت کو طشت از بام کردیتی ہے اس لیے مسیحی دنیا نے اُس کو ہر ممکن طریقہ سے منظر عام پر آنے سے روکنے کی کوششیں کیں ۔ ۲۹۶ء میں سرکاری طور پر پاپائے روم گلاسیس نے اس کتاب کو گمراہ کن قرار دے کر اس کے مطالعہ پر پابندی عاید کر دی ۔ اور اس کو اپنے پاس رکھنا جرم قرار پایا ۔ ۱۷۰۹ء میں جا کر کہیں اس کا اطالوی ترجمہ ملنے لگا ۔ اور ۱۹۰۷ء میں ایک پادری مسٹر ریگ (RAGG) اور اس کی بیوی نے اس اطالوی ترجمہ کو انگریزی میں منتقل کیا ۔ زیر تبصرہ کتاب (باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) جن خطوط پر اپنی پارٹی کی تشکیل کی تھی انہیں خطوط پر اس نے پیپلز پارٹی کو منظم کیا۔ اس نے پارٹی کے لیے جو نعرہ تجویز کیا اُس سے دین کے دو تہائی حصّے کی برملا نفی کی گئی۔ بھٹو صاحب سے پہلے کسی عوامی رہنما کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ اس ملک کے نظامِ حیات کے بارے میں یہ کہتا کہ "اشتراکیت ہماری معیشت ہے" اور دین زندگی کے صرف مذہبی گوشے تک محدود ہے۔ پھر اس نے اپنی جماعت میں اہم عہدوں پر تو بڑے بڑے جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کو فائز کیا مگر غریبوں کو بیوقوف بنا کر اپنے پیچھے لگانے کے لیے ان کی ہمدردی میں آنسو بہائے۔ لوگ بھٹو صاحب کی اس عیاری کو ان کے گہرے تاریخی شعور سے تعبیر کرتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ ذہنی منافقت اور بے کسوں کے ساتھ شرمناک مذاق ہے۔ اگر اس دھوکہ بازی کو کوئی شخص تاریخی شعور سمجھتا ہے تو پھر ہٹلر اور مسولینی بھٹو صاحب سے کہیں زیادہ باشعور تھے۔ اس تاریخی شعور نے اُن آمروں اور اُن کے پیروکاروں کو جس المناک انجام تک پہنچایا اُسے نگاہ میں رکھ کر ذرا سوچیے کہ اس گہرے شعور کا مالک سیاستدان کیا اپنے لیے اسی انجام کو پسند کرتا ہے؟ تاریخی شعور عوام کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے اور اُن کے سطحی جذبات سے شرمناک کھیل کھیلنے کا نام نہیں بلکہ تاریخ کی روشنی میں کسی قوم کے لیے ایسا طرزِ فکر متعین کرنے اور ایسا اسلوبِ حیات ترتیب دینے کا نام ہے جو اسے ہلاکتوں سے بچا کر فلاح و کامرانی کی راہ پر گامزن کر سکے۔

برناڈ شا نے ایک موقع پر کہا تھا کہ جو شخص ایک پونڈ کی چوری کرے وہ چور کہلاتا ہے اور جو ایک لاکھ پونڈ ہتھیا لے اُسے فنکار کہا جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی المیہ ہماری موجودہ تاریخ کا ہے کہ اگر کوئی فرد کسی شخص کی غفلت، جہالت اور بے بسی سے فائدہ اُٹھا کر اُسے لُوٹ لے تو وہ خائن اور مجرم گردانا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مکار اور عیار سیاستدان اپنی چرب زبانی اور دلفریب نعروں کے بل پر پوری قوم کو بیوقوف بنا کر اس سے ہر قسم کے ناجائز مفادات حاصل کر لے تو وہ قوم کا نجات دہندہ بن بیٹھتا ہے۔

مسٹر بھٹو نے ایک طرف تو قوم کے جذبات کو بھڑکایا، اس کے اندر طبقاتی منافرت اور کشمکش پیدا کی اور دوسری طرف جمہوریت کے نام پر جمہوریت کا خون کیا۔ ایوب خان کے دورِ اقتدار میں بحالیٔ جمہوریت کی جو تحریک چلی تھی اس میں اسے اس امر کا پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ اگر مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ساتھ رہیں تو اس ملک میں آمریت کا تسلط قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی خطے کی وسعت، خصوصاً جب اس کے دو حصوں کے درمیان ہزار میل کا فاصلہ حائل ہو، آمریت کی راہ کا سنگِ گراں ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے اپنی آمریت کے قیام کے لیے پاکستان کے مشرقی بازو کو مغربی بازو سے الگ کر کے بنگلہ دیش کی صورت میں ایک نیا ملک بنانے کی سازش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مغربی پاکستان میں نوکرشاہی کی مدد سے ایک نہایت ہی ظالمانہ قسم کی آمریت قائم کی۔ اشتراکیت چونکہ ایک غیر فطری نظامِ حیات ہے اس لیے کسی ملک میں اس کو خوشدلی سے قبول نہیں کیا گیا اسے جہاں بھی نافذ کیا گیا وہاں عوام کے منشا کے علی الرغم بالجبر نافذ کیا گیا۔ دہشت، غنڈہ گردی، جبر و تشدد اور قتل و غارت اس نظام کے عناصرِ ترکیبی ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں اشتراکیت کے سارے تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ بے دین طبقوں نے حکومت کی شہ پا کر دینِ حق کے خلاف اپنے دل میں چھپے ہوئے کینوں کا برملا اظہار کیا اور اسلامی اقدار کا کھلے بندوں مذاق اڑایا۔ رشوت خوری، چور بازاری، ظلم و زیادتی اور زیردست آزاری کی سرکاری سطح پر سرپرستی کی گئی تاکہ عوام سراسیمہ ہو کر ان قدروں کو خود ہی پامال کرنا شروع کر دیں جنہیں وہ اب تک عزیز رکھتے تھے اور جن کی بدولت ان کا ملی تشخص قائم تھا۔ ملک میں غریبوں کی ہمدردی کے نام پر معاشی استبداد کے ایک نئے دور کا آغاز کیا گیا۔ جس سے صنعتیں تباہ ہو گئیں اور افراطِ زر میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس طرح معاشی زندگی میں جان بوجھ کر ایک ایسا خوفناک تعطل پیدا کیا گیا جو ملکی ذرائع پیداوار کو پوری طرح قومیائے بغیر کسی طرح دور کرنا ممکن نہ تھا — افراتفری، شدید اضطراب اور بے یقینی کی اس فضا میں جب لوگوں کے لیے جینا تو کیا سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا ہو عوام اپنے نظامِ حیات میں ہر قسم کی تبدیلی قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جس طرح کوئی بے دین ظالم جب کسی شریف انسان کے حلق سے کوئی حرام شے زبردستی اتارنے کا تہیہ کر لے تو اس کے لیے سب سے پہلے اسے ہر حلال چیز سے محروم کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ

بے بسی کے عالم میں حرام کھانے پر مجبور ہو جائے اسی طرح بھٹو صاحب نے ملک کے اندر دہشت گردی، نفسا نفسی اور خود غرضی کا ایک ایسا گھناؤنا ماحول پیدا کر دیا جس میں لوگ مجبوراً اشتراکیت کی طرف کھچے چلے جائیں۔ شرفاء ان ابتر حالات کے اندر اس حد تک پس چکے تھے کہ ان کے اندر اپنی تہذیبی روایات کو بچانے کی قوت دم توڑنے لگی۔ صاحبِ ضمیر سرکاری ملازم حکمرانوں کی چیرہ دستیوں سے اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے تحفظ کی خاطر عدل و انصاف کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو "شاہ سے بڑھ کر شاہ کے خیر خواہ" ثابت کرنے کی کوشش کی — سماج دشمن عناصر نے بھٹو صاحب کے دورِ اقتدار کو غنیمت سمجھا اور پیپلز پارٹی کے سایہ میں پناہ لے لی۔ خود غرض سیاستدانوں نے "قائدِ عوام" کے منظورِ نظر بن کر ملکی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ اِدھر "قائدِ عوام" بھی ان آبرو باختہ لوگوں کی ان ساری حرکات کو بنظرِ استحسان دیکھتا رہا کیونکہ حکمرانی کا یہ ناپاک اصول اس کے پیشِ نظر تھا کہ کسی صاحبِ اقتدار کے رفقاء کار جس قدر زیادہ بد قماش، بے اصول اور بے ضمیر ہوں اسی نسبت سے اس کی کرسی زیادہ مضبوط ہوتی ہے کیونکہ اغراض کے بندوں کی مصاحبت میں اسے کسی طرف سے اختلافِ رائے کا ڈر نہیں ہوتا۔

بعض سطح بین لوگوں کا خیال ہے کہ بھٹو صاحب نے دانستہ نہیں بلکہ محض اپنے لا ابالی پن میں ملک کے حالات کو بگاڑا ہے۔ مگر یہ ان حضرات کی کوتاہ اندیشی ہے۔ "قائدِ عوام" کی شخصیت کو بعض غیر ملکی طاقتوں نے ملک کے بے دین عناصر کی معاونت سے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ابھارا اور سازش کے ذریعے اسے ایوب خاں سے الگ کر کے پیپلز پارٹی بنوائی۔ پھر سنہ ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں انہوں نے مغربی پاکستان کے اندر اس کی پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے پوری طرح تگ و دو کی اور بالآخر شاہنواز بھٹو کے اس فرزندِ دلبند کو جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا، جس نے امریکہ اور انگلستان میں تعلیم و تربیت پائی، زرداروں کے جلو میں تخت و تاج کا مالک بنوایا۔ جس شخص کو اقتدار میں لانے کے لیے اتنے جتن کیے گئے ہوں وہ اگر لادین عناصر کے ناپاک ارادوں کی تکمیل نہ کرتا تو کیا کرتا؟

یہ "قائد عوام" کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں بے دینی عُریاں ہوکر اسلام کے خلاف ایک معاندانہ تحریک کے طور پہ اُبھری ہے۔ اس نے تمام اسلام دشمن عناصر کو ایک مرکز پہ جمع کیا ہے۔ انہیں دینِ حق کے خلاف کھلے طور پہ ہرزہ سرائی کا موقع دیا ہے۔ بھٹو صاحب دراصل عوام کے قائد نہیں بلکہ لوگوں کی عفت و ناموس سے کھیلنے والے دین سے بیزار اور اخلاق سے عاری طبقوں کے مربی اور سرپرست ہیں۔ یہ طبقے اُن کی ذات میں اپنا آئیڈیل دیکھتے ہیں[1] کیونکہ ان کی عملداری سے لادین اور غنڈہ عناصر کو ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوتا ہے اور یہ عناصر بھٹو صاحب کی بے پایاں عنایات سے بہرہ ور ہونے والے نو دولتیے منہ زور ہوگئے ہیں اور وہ اپنی بقا اور معاشرے پہ اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے ہر قیمت پر "قائد عوام" کو تختِ شاہی پر براجمان دیکھنا چاہتے ہیں۔

یہ صورتِ حال دینی اعتبار سے اگرچہ بڑی اندوہناک ہے لیکن اس کا ایک فائدہ بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ مسلم معاشرے کے مارِ آستین کھل کر میدان میں آگئے ہیں۔ ان کے منصوبوں، ان کے رنگ ڈھنگ اور جارحانہ عزائم سے دیندار طبقے بخوبی آگاہ ہوئے ہیں اور انہیں اس بات کا کسی حد تک احساس ہوگیا ہے کہ جب تک ان شرپسند عناصر کا زور نوڑا نہیں دیا جاتا اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی آرزو، آرزو ہی رہے گی، شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکیگی۔ دوسری طرف الحاد کی قوتوں نے بھی حالات کی سنگینی کو اچھی طرح بھانپ لیا ہے اور وہ ہر اعتبار سے مسلح ہوکر یہ معرکہ سر کرنے کا تہیہ کرچکی ہیں۔ اس

---

[1] ان عناصر کو قائد عوام کی ذات سے کس قدر ذہنی اور جذباتی لگاؤ ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ایک جگہ پہ چند نوجوان بھٹو صاحب کے محاسن و معائب پر گفتگو کر رہے تھے۔ بحث کے دوران بھٹو صاحب کے حامی دلائل کے میدان میں بالکل عاجز آگئے تو انہوں نے پُرجوش انداز میں کہا، تم اس پہ ہمیں طعنہ دیتے ہو کہ ہم تھوڑی سی شراب پینے والے آدمی کو اپنا رہنما مانتے ہیں؟ بھٹو اگر ہمیں مندروں میں جاکر بتوں کی پوجا کرنے کا حکم دے تو ہم یہ کام بھی پوری خوش دلی سے کرنے کے لیے تیار ہیں اور ہر حال میں ان کا ساتھ دینے پر کمربستہ ہیں۔

فیصلہ کن مرحلہ پہ دینِ حق کے شیدائیوں کو اپنی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں اس حقیقت سے انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہونا چاہیے کہ پاکستان قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے درمیان محاذ آرائی ملک کی دو سیاسی جماعتوں کے درمیان آویزش نہیں بلکہ یہ دو متحارب نظریات کی جنگ ہے۔ اگر اس ملک میں اسلام کی عملداری قائم ہوتی ہے تو پھر اشتراکیت، فسق و فجور اور جبر و تشدد کی کوئی گنجائش نہیں اور اگر معاذ اللہ یہاں اشتراکیت کو ایک غالب قوت کی حیثیت سے مسلط ہونا ہے تو پھر پاکستان کی سرزمین میں کوئی فرد بحیثیت مسلمان زندہ نہیں رہ سکتا۔

(بقیہ مطبوعات)

اسی انگریزی ایڈیشن کا اُردو ترجمہ ہے۔

آسی ضیائی ایک صاحبِ علم اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ ادبی دنیا میں معروف ہیں۔ ان کا ترجمہ سادہ، دلکش اور سلیس ہے۔ وہ اس علمی کارنامے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہمارے مسیحی بھائیوں کو تعصب سے خالی ہو کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ راہ ہدایت کے بے شمار نشانات ان کے سامنے واضح ہو جائیں گے۔ مسلمان اہل علم کے لیے بھی اس کا مطالعہ نہایت کارآمد اور معلومات افزا ثابت ہوگا۔

کیا !

- آپ نے اِس کتاب کا مُطالعہ کیا ہے جس کی بدولت بہت سے مُشرکین مشرّف باسلام ہو چکے ہیں ؟
- جو دُنیا کی ۲۲ زبانوں میں چھپ رہی ہے۔
- جس کی کروڑوں جلدیں دُنیا کے گوشے گوشے میں زیرِ مطالعہ ہیں۔

آپ بھی اپنے دینِ اسلام کی حقیقت کو جاننے کے لیے آج ہی

سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی کی تصنیف

دینیات (نیا ایڈیشن)

کا مُطالعہ کیجیے

جامع مگر مختصر اور عام فہم تشریحات سے آراستہ ایک ایمان افروز کتاب جسے عام اُردو دان احباب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی شوق و ذوق سے پڑھتے اور اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں میں منظور شدہ۔ ہر بک اسٹال سے دستیاب۔ قیمت: ۷/- روپے۔

اِدارۂ ترجمانُ القرآن، اِچھرہ۔ لاہور

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اِس میں مترجم نے قرآن حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں، تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادھا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اُٹھا سکیں

ھدیہ قسم اعلیٰ	-/۷۵ روپے
ھدیہ قسم دوم	-/۶۰ روپے

ناظم اِدارۂ ترجمان القرآن، اِچھرہ - لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ —— ۴۱۱۰۱۷